مباحثہ شاہجہاں پور

افادات

حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم النانوتوی

بانی دار العلوم دیوبند

حجۃ الاسلام اکیڈمی

دار العلوم وقف دیوبند

سلسلۂ مصنفاتِ امام نانوتویؒ: ۲

مباحثۂ شاہ جہاں پور

افادات:

حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم النانوتوی رحمہ اللہ
بانی دار العلوم دیوبند

ناشر:

حجۃ الاسلام اکیڈمی، دار العلوم وقف دیوبند سہارنپور

مباحثۂ شاہ جھانپور

افادات: حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی نوراللہ مرقدہ
بانی دارالعلوم دیوبند

طبع اولیٰ: ۱۴۳۸ھ-۲۰۱۷ء

ISBN: 978-93-84775-04-9

باهتمام: حجۃ الاسلام اکیڈمی، دارالعلوم وقف دیوبند، سہارنپور، یوپی، الہند

جملہ حقوق بحق ناشر: حجۃ الاسلام اکیڈمی، دارالعلوم وقف دیوبند محفوظ ہیں۔

Composed by: Abdul Mannan Qasmi
Copyright © Hujjat al-Islam Academy
Darul Uloom Waqf Deoband
All rights reserved.

Hujjat al-Islam Academy
Aljamia Al-Islamia Darululoom Waqf Deoband
Eidgah road, P.O. 247554, Deoband
Distt. Saharanpur U.P. INDIA
Tel : +91-1336-222352, Mob: +91-9897076726
Email: hujjatulislamacademy2013@gmail.com
hujjatulislamacademy@dud.edu.in
Website: http://www.dud.edu.in

Pritnted at: Mukhtar Press, Deoband

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مضامین

مضامین | صفحہ نمبر

کلماتِ ترحیب

بانی دارالعلوم دیوبند، حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم النانوتوی رحمہ اللہ اپنے وقت کے چیدہ و چنندہ شخصیات میں سب سے ممتاز، سب سے منفرد اور جماعتِ علمائے دیوبند کے سرخیل ہی نہیں؛ بلکہ ایک جنسِ نایاب اور جوہرِ فرد تھے۔ان کے علمی تفوق کا ایک زمانہ معترف ہے،اوران کی دینی وسیاسی رہنمائی اور ملی قیادت وسیادت ہر ایک کو تسلیم تھی۔ ردِّ فرقِ ضالہ کے سلسلے میں ان کی خدمات بے حد نمایاں اور خاص طور پر مقارنہ بین الادیان پرتو آپ کی خدمات بے لوث ہیں۔

''میلۂ خدا شناسی'' کے نام سے شاہ جہاں پور میں مسلسل دو سال تقابلِ ادیان پر کانفرنس کا انعقاد ہوتا رہا، جس میں بہر دو سال حضرت الامام النانوتویؒ نے بفضل الٰہی ہندومت اور عیسائیت کے مدلل تقابل میں مذہبِ اسلام کی حقانیت کو بایں طور بیان کیا کہ خود باطل یہ اعتراف کرنے پر مجبور نظر آیا کہ: ''اگر کسی کی تقریر پر ایمان لایا جاتا، تو اس نیلی لنگی والے کی تقریر پر ایمان لاتے''؛ حتی کہ بعض پنڈتوں نے تو یہ بھی کہا کہ: ''اس کے قالب سے کوئی اوتار بولتا ہے''، جس سے حضرت الامامؒ کی غزارتِ علم اور اعلائے کلمۃ الحق کے لیے انوکھے اسلوبِ بیان پر روشنی پڑتی ہے، جو واہب العطا کی طرف سے خال خال کسی کو عطا ہوتا ہے۔

دوسرے سال کے میلۂ خدا شناسی میں کی گئی متعدد تقاریر کا یہ مجموعہ ''تقابل ادیان'' کے موضوع پر گوہر آبدار اور تحفۂ گراں مایہ ہے، جس کی اہمیت وافادیت اور ضرورت وحاجت سے علم دوست طبقہ خوب واقف ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ حجۃ الاسلام اکیڈمی، دارالعلوم وقف دیوبند کو اپنے منصوبے میں کامیاب کرے، اس کی ہمہ جہت خدمات کو شرف قبولیت سے نوازے، اس کی نصرت واعانت فرمائے، اوراس کتاب کے نفع کو عام وتام فرمائے۔

محمد سالم قاسمی

صدر مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند

تقریظ

جہالت کی ظلمت وتاریکی میں سرگرداں انسانیت کونورِ علم وعمل سے منور کرنے اور منور رکھنے کے لیے اپنے اپنے عہد، فکر ومزاج، اقدار وروایات کے نبض شناس عارفین، شئونِ علم کے مختلف النوع اختصاصات وامتیازات کے ساتھ امت کی رہنمائی کے لیے ذاتِ حق جل مجدہ کی طرف سے اس کی سنت ومشیت کے عین مطابق دنیا کے مختلف خطوں اور علاقوں میں سرگرم عمل رہتے ہیں، اور اپنے اپنے عہد کے فکری تغیرات اور ذوق ومزاج کے علی الرغم صدیوں پر محیط یہ سلسلۂ علم وہدایت تا قیامِ قیامت مستمر رہے گا۔ کلام اللہ کے ابدی اصول ''فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ'' کے مطابق زبان وبیان اور تفہیمِ معارف کے تکوینی تفاوت وخصوص کے نقطۂ نظر سے اثر اور کارگاہِ عمل میں امتدادِ وقت بھی دراصل سنت اللہ اور اس کی مشیت کا ہی ایک حصہ ہے۔

اس قرارِ واقعی تمہید کے تناظر میں بانی دار العلوم دیوبند، حجۃ الاسلام، حضرت الامام حضرت مولانا محمد قاسم النانوتوی قدس سرہ کی اثر انگیز، نابغۂ روزگار اور عبقری شخصیت، وسعتِ فکر وعمل اور مرتبۂ علم وفضل کے لحاظ سے من جانب ذاتِ حق جل مجدہ اخص الخاص مقام رفعت پر نظر آتی ہے۔ ڈیڑھ سو سالہ عہد رفتہ کے تاریخی شواہد میں ''میلۂ خدا شناسی'' کے نام سے معروف مباحثۂ شاہ جہاں پور، جہاں ایک طرف حضرت الامامؒ کی علویت فکر، قوتِ استدلال اور شانِ عزیمت کے ساتھ تعمقِ علم کی ایک بیّن شہادت ہے، تو وہیں دوسری طرف علمی دوائر واجتماعیات میں آج بھی امتدادِ زمانہ کے باوجود استدلالی نقطۂ نظر سے حجت اور مالہ وماعلیہ کے لحاظ سے مسلّم الثبوت دستاویزی شہادت کی حامل تحریر شمار کی جاتی ہے۔

برصغیر ہندوپاک کے مختلف اداروں اوراہل علم کی جانب سے اس کی اشاعت کا اہتمام بذاتِ خوداس تحریر کی مقبولیت واثر انگیزی کی دلیل ہے۔تاہم کثرتِ اشاعت کے سبب اس کے متن وعبارات میں پایا جانے والا فرق، اہل علم کے لیے ذہنی خلجان کا باعث تھا۔ چناں چہ عزیزم مولانا محمد شکیب قاسمی سلمہ کی زیر نگرانی دار العلوم وقف دیوبند کے شعبۂ بحث وتحقیق: حجۃ الاسلام اکیڈمی کے شامل اہداف ومقاصد کے تحت حتی المقدور کوشش وکاوش کرکے مباحثۂ شاہ جہاں پور کے ہندوپاک میں شائع شدہ تمام دستیاب نسخوں کوجمع کیا گیااور اس میں قدیم ترین نسخہ کومعیار قرار دے کراصلاحِ اغلاط کا کام کیا گیا۔علاوہ ازیں سنجیدہ علمی دوائر کے فکرومزاج کے مطابق تخریج وتحقیق بھی اس راہ کا ایک بڑا امرحلہ تھا، جس کوبحمد اللہ! دقتِ نظر اور تعمقِ فکر کے ساتھ انجام دیا گیا ہے۔ گویا کہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ زیرنظر کتاب تحقیق وتخریج کے علی الرغم اپنے متن کے لحاظ سے اقرب الی الاصل ہے۔

قابلِ ذکر ہے کہ زیرنظر کتاب حجۃ الاسلام اکیڈمی کے اہداف ومقاصد کی دوسری کاوش ہے، جب کہ اس سے قبل بانی دار العلومؒ کی معرکۃ الآراء کتاب ''تحذیر الناس'' مذکورہ مراحل سے گزرکر زیورِ طبع سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آچکی ہے۔

حجۃ الاسلام اکیڈمی سے ''تحذیر الناس'' اور ''مباحثۂ شاہ جہاں پور'' کی اشاعت دراصل اکیڈمی کے اپنے علمی اہداف کی سمت ایک لائق تحسین وستائش قدم ہے۔ دعا گوہوں کہ حق تعالی تمام شرکائے کار کی محنتوں کوشرف قبولیت سے سرفراز فرماتے ہوئے اپنے اکابرواسلاف کی عظیم الشان علمی تراث کودورِ حاضر کے تحقیقی ذوق ومزاج کے مطابق منصۂ شہود پرلاتے رہنے کی توفیق ارزانی فرمائیں۔ وباللہ التوفیق

محمد سفیان قاسمی

مہتمم دار العلوم وقف دیوبند

عرضِ ناشر

''مباحثۂ شاہ جہاں پور'' حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نور اللہ مرقدہ، بانی دار العلوم دیوبند کے دوسرے سال کے ''میلۂ خداشناسی'' (منعقدہ: چاندا پور، ضلع شاہ جہاں پور بتاریخ: ۱۲۹۴ھ/۱۸۷۷ء) کے بیانات سے افادات کا مجموعہ ہے، جس کو حضرت مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی رحمہ اللہ نے مرتب فرمایا تھا۔

انگریز حکومت نے عیسائیت کے فروغ اور سارے ہندوستانی مذاہب کو اپنے رنگ میں رنگ دینے کی ناپاک اور ناکام کوششوں کا بظاہر لامتناہی سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی یہ بھی تھی، کہ ہندوؤں کے ذریعہ میلے وغیرہ کا انعقاد کرایا جائے، اور اس میں بین المذاہب گفتگو ہو، پھر بزعمِ خویش عیسائیت کا غلبہ ہوگا اور اس کا نفاذ و عمل داری میں سہولت اور آسانی ہو جائے گی۔ اسی لیے ملک بھر میں پادریوں کا جال پھیلا دیا تھا، جو عیسائیت کی تبلیغ و اشاعت میں کسی بھی حد تک جانے کو تیار تھے۔

پادری نولس نے منشی پیارے لال چاندا پوری کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ بین المذاہب میلہ منعقد کیا جائے، اور اس میں ہندومت، اسلام اور عیسائیت کے نمائندوں کو مدعو کیا جائے؛ چناں چہ ایسا ہی کیا گیا، اور ۱۲۹۳ھ-مطابق ۱۸۷۶ء میں پہلا میلہ منعقد ہوا، جس میں سب کو منھ کی کھانی پڑی، اور بہ امدادِ خداوندی اہل اسلام کا غلبہ رہا۔ پادریوں کو اپنی ذلت و رسوائی برداشت سے باہر ہو رہی تھی؛ اس لیے اس سے اگلے سال پھر اسی نوعیت کے میلہ کا اعلان کرایا گیا، جس میں شرکت کے لیے بڑے بڑے پادریوں کو انگلستان سے بلایا گیا، پھر بھی انجام کار سب کو ''خَسِرَ هُنَالِكَ الْكَافِرُوْنَ'' کا مصداق ہونا پڑا، اور ان کے تمام عزائم دھرے کے دھرے رہ گئے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اُس میلہ میں اگر حجۃ الاسلام الامام النانوتویؒ شریک

نہ ہوتے، جیسا کہ ان کی طبیعت ناساز بھی تھی، اور دہلی پہونچ جانے کے بعد مولوی عبدالحی صاحبؒ کی رائے بھی یہی ہورہی تھی کہ آپ واپس ہوجائیں، تو شرر افشانیوں اور شعلہ سامانیوں کی جو آگ اُس دریدہ دہن موذی پادری کے الفاظ میں دبی ہوئی تھی، بقول مولانا مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ: ''کیا کسی اور غریب مولوی کے بس کی بات تھی کہ بھڑکنے سے اس کو روک دیتا''۔ اُس وقت کے حالات بہ زبانِ حال اب بھی یہ کہہ رہے ہیں کہ آیۃ من آیات اللہ، حجۃ اللہ فی الارض، حجۃ الاسلام، الامام الاکبر مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کے بغیر یہ ممکن نہ تھا۔

یہی وجہ ہے کہ جس طرح سورۂ نصر کے نزول کے بعد سارے صحابہ رضی اللہ عنہم خوش ہورہے تھے کہ اب اسلام کا غلبہ ہوگا؛ کیوں کہ لوگوں کے جوق در جوق اسلام میں داخل ہونے کی خدائی بشارت آچکی ہے؛ لیکن سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ زار وقطار رو رہے تھے۔ جب اُن سے برموقعۂ خوشی رونے کا سبب دریافت کیا گیا، تو انہوں نے فرمایا کہ: یہ خوشی کا موقع نہیں؛ بلکہ رونے کا مقام ہے؛ کیوں کہ اس میں اشارہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اب ہمارے بیچ زیادہ دن نہ رہیں گے۔

اسی طرح میلۂ خداشناسی میں مسلمانوں کی فتح وکامرانی کی خبر جب حضرت مولانا یعقوب صاحب نانوتویؒ کو پہونچی، تو خوشی منانے کے بجائے رونے لگے۔ لوگوں نے سبب پوچھا، تو سیدنا صدیق اکبرؓ والا جواب دیا، کہ اللہ نے شاید حجۃ الاسلامؒ کو اسی دن کے لیے پیدا کیا تھا، اب غلبۂ دین ہوگیا، اب ان کی اس دار فانی سے رخصتی کا وقت قریب ہے۔ اور ایسا ہوا بھی کہ اس کے بعد پورے دو سال بھی بقید حیات نہیں رہے۔

القصہ اس مجموعہ میں چوں کہ اُس آخری میلہ کی مکمل روداد، اور اسلام کی حقانیت، بے بنیاد اعتراضات کا علمی وتحقیقی اور تشفی بخش جوابات، عیسائیت اور

ہندومت کی اصلیت کو واشگاف کیا گیا ہے، جو تقابلِ ادیان کے موضوع پر ایک منفرد، نایاب اور گراں بار تحفہ ہے، جسے حجۃ الاسلام اکیڈمی، دار العلوم وقف دیو بند شائع کر کے علوم قاسمی کے وابستگان کو فکر قاسمی سے قریب کرنے اور فیضانِ قاسمی سے محظوظ ہونے کا سنہرا موقع فراہم کرنے کی ایک ادنیٰ کوشش کر رہی ہے۔

چوں کہ ''حجۃ الاسلام اکیڈمی'' کے اولین اساسی اور بنیادی اہداف واغراض میں سے حجۃ الاسلام علیہ الرحمہ کی تصنیفات کی تحقیق وتخریج اور تشریح وتوضیح اور تسہیل کر کے ان کو خواص وعوام کے لیے یکساں مفید بنا کر شائع کرنا ہے، جس میں پہلا قدم تمام متون کی تحقیق وتخریج، اور دوسرا ان کی تسہیل وتشریح کا ہوگا۔ ان شاء اللہ!

اور اس بات کی وضاحت بھی ناگزیر ہے کہ حجۃ الاسلام الامام النانوتویؒ کی تمام مؤلفات وافادات اب تک یکجا کہیں دستیاب نہیں ہیں، جس سے علوم قاسمی کے خوشہ چینوں کو کافی شکایت رہتی ہے، کہ وہ فکر قاسمی سے منسلک ہوتے ہوئے بھی بانی دار العلوم کی فکر سے دوری محسوس کرتے ہیں۔ اور جو چند مؤلفات وافادات دستیاب بھی ہیں، تو ان میں کتابت کی بہت سی خامیاں؛ بلکہ غلطیاں ہیں، جن کا ادراک بوقتِ ترتیبِ جدید، قدیم ترین نسخوں سے مراجعت کے بعد ہوا۔

اسی لیے حجۃ الاسلام اکیڈمی نے سلسلہ وار تمام تصانیف ومؤلفات کی اشاعت کا عزم مصمم کیا ہے، جس میں درج ذیل امور کی طرف خاصی توجہ مبذول کی گئی ہے:

(۱) اصل متون سے مراجعت کو حتمی قرار دیا گیا ہے، تاکہ کسی طرح کی کمی، کوتاہی اور غلطی حتی المقدور باقی نہ رہ پائے۔

(۲) آیات وروایات کی تحقیق وتخریج کی طرف خاص عنانِ عزیمت مبذول کی گئی ہے، تاکہ مستفیدین کی طمانینتِ خاطر کا سامان مہیا ہو، اور بوقتِ ضرورت کتب محولہ سے مراجعت کرنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔

(۳) اصل متون میں چوں کہ ذیلی عنوانات مکتوب نہیں تھے، تو ذیلی عنوانات بہ مناسب مضامینِ کتاب کے اندراج کا اہتمام کیا گیا ہے۔

(۴) جدید اسلوبِ نگارش اور علاماتِ ترقیم کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔

(۵) اور مؤلفات ومصنفاتِ امام نانوتویؒ میں انڈیکسنگ کا بھی اہتمام کیا جارہا ہے۔

اسی مستحسن اور مبارک سلسلہ کی دوسری کڑی ''مباحثۂ شاہ جہاں پور'' کی اشاعت ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ تشنگانِ علوم قاسمی کو سیراب کرنے اور تقابلِ ادیان سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے سامانِ اُنس وتپاک مہیا کرنے میں یہ کتاب ممد ومعاون اور مددگار ثابت ہوگی، اور صراط مستقیم کے جویاؤں کو ان کی طمانینتِ خاطر اور تسکینِ قلب وجگر کا سامان مہیا کرے گی۔ ان شاء اللہ!

میں اس موقع پر مفتی عبدالمنان صاحب قاسمی کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ جن کی جہد مسلسل سے یہ کتاب زیورِ طبع سے آراستہ ہوکر نذرِ قارئین ہونے جارہی ہے۔ موصوف نے نہ صرف دقتِ نظر کے ساتھ تصحیح کا کام کیا؛ بلکہ نصوص اور روایات کی تخریج کو بھی بحسن وخوبی انجام دیا اور حسبِ مضامینِ کتاب عناوین بھی لگایا۔ اللہ تعالیٰ موصوف کے لیے اس کام کو دنیا وآخرت کی فلاح وکامرانی کا ذریعہ بنائے، اور ان کی اس کاوش کو قبول فرمائے۔ آمین

محمد شکیب قاسمی
ڈائرکٹر: حجۃ الاسلام اکیڈمی، دارالعلوم وقف دیوبند
۲۵/ذوالقعدہ ۱۴۳۸ھ-مطابق ۱۸/اگست ۲۰۱۷ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمۂ مرتب

آفتاب آمد ولیلِ آفتاب
گرد لیلت باید از وے رومتاب

یا اللہ! تیری ذات پاک سب پر محیط اور سب پر غالب، سب تیرے جویاں اور سب تیرے طالب؛ لیکن تیری معرفت وہم کی رسائی سے الگ، خیال کی مجال سے پرے، قیاس کی وسعت سے باہر ہے؛ اس لیے تیرے سچے رسول ﷺ نے وہمی خداؤں کی بندگی سے دنیا کو چھڑایا، اور جو قدرتی اصول تو نے ہر انسان میں رکھ دیے ہیں، ان کو شگفتہ کیا۔ تیرے کلام پاک نے ایمان بالغیب کی تعلیم دی، اور تیری جانب رجوع کرنے کا ایسا طریقہ سکھایا، جو فی الحقیقت ہماری بندگی اور تیری خدائی، ہمارے نقص اور تیرے کمال کے لیے شایاں ہے۔

یا اللہ! تیرا سب سے پچھلا؛ مگر سب سے افضل رسول، جو تیرے مقدس کلام سے گویا ہوا، اور جس نے تیری روشن ہدایت سے عقل کو نور، دل کو سرور بخشا، اس نے ایسا علم اور ایسی مستقیم راہ نسلِ انسان کو بتائی ہے، کہ جو انسان کے حق میں کامل رحمت اور اعلیٰ نعمت ہے۔ صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ اجمعین؛ لیکن طالبِ صادق اور شوقِ کامل درکار ہے۔

اب بھی نائبانِ رسول اور علمائے فحول ایسے موجود ہیں، جن کا بیان منشاء الٰہی کی تفسیر اور علم انبیاء علیہم السلام کی تشریح ہے، اور اس سے سامعین کے دل کو تشفی اور پڑھنے والوں کے دل کو کامل خوشی حاصل ہو سکتی ہے۔ چناں چہ ''میلۂ خداشناسی'' واقع شاہ جہاں پور میں جو علمائے اسلام و ہنود و عیسائیوں کا مباحثہ ہوا، اس کی کیفیت ناچیز، کمترین انام، فخر الحسن نام اہل نظر کے روبرو پیش کرتا ہے:

منشی پیارے لال اور پادری نولس کی ملاقات:

''وَھُــــــوَ ھَــــــذَا'':

صاحبو! اس جلسہ کے بانی مبانی منشی ''پیارے لال'' کبیر پنتھی ساکن ''چاندا پور''، ضلع و تحصیل شاہ جہاں پور ہیں، ذی مقدور اور صاحبِ جائداد شخص ہیں۔ پادری نولس صاحب، جو پار سال تک مشن اسکول شاہ جہاں پور کے ماسٹر رہے، اور اب کانپور کو بدل گئے ہیں، جب شاہ جہاں پور کے دیہات کا دورہ کرتے، تو چاندا پور میں بھی اکثر وعظ کہتے، اور منشی پیارے لال ان کے لکچر کو بگوشِ دل سنتے۔ رفتہ رفتہ پادری صاحب نے اپنی توجہ ان پر ڈالی اور انس و تپاک پیدا کیا۔ اور پھر آپ جانتے ہیں کہ اول تو پادری صاحب اور پھر وہ بھی یورپین، پس ان کے خلق کی بو اور صحبت کی حرارت پوستی کی آنچ تو تھی نہیں، جو خالی جاتی، تپ دق کی طرح اعضائے باطنی واصلی تک پہونچ گئی اور پھر یہ بھی ہوا کہ پادری صاحب کی ملاقات سے ان کی عزت اور توقیر بھی بڑھ گئی۔

تقابلِ ادیان کانفرنس کے اصل محرک:

جب ان کے خیر خواہوں نے دیکھا کہ منشی صاحب اپنی حالت دیرینہ کی طرح اپنے آبائی عقیدے کو بھی پارینہ سمجھنے لگے، تو انہوں نے یہ صلاح دی کہ اپنی مملوکہ زمین

اور باغات موضع سر بانگ پور، ملحق سوانہ چاندا پور میں بلبِ ''دریائے گرّا'' ایک ''میلۂ خدا شناسی'' مقرر کرو، اور اس میں علمائے مذاہب مختلفہ کا مناظرہ ہو، اور طرح طرح کی مخلوق دور اور نزدیک کے جمع ہوں، جس سے تحقیق مذہب بھی ہو جائے گی اور اس میلہ سے کچھ اور بھی فائدے کی صورت ہو جائے گی۔

چناں چہ انہوں نے ایسا ہی کیا کہ مسٹر رابرٹ جارج گری صاحب بہادر کلکٹر مجسٹریٹ شاہ جہاں پور سے اجازت حاصل کر کے پارسال ۷رمئی کو عین شباب گرمی میں یہ میلہ منعقد کیا، جس میں مدعی مذہب عیسائی پادری ''نولس'' صاحب سب کے سرغنہ تھے، اور اہل اسلام کی طرف سے مولوی ''محمد قاسم'' صاحب اور مولوی ''سید ابوالمنصور'' صاحب رحمہما اللہ۔

تقابل ادیان کانفرنس بار اول کا نتیجہ:

پس اس جلسہ کا نتیجہ تو سب پر ظاہر ہی ہو گیا تھا کہ مولوی محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ کی نیلی لنگی کے نام سے فتح کا پھریرہ سارے عالم میں مشہور ہو گیا۔ اور کتاب کیفیت واقعی اس جلسہ کی مطبع ضیائی میں چھپی، جس کا تاریخی نام ''گفتگوئے مذہبی'' ہے اور قیمت اس کی علاوہ محصول کے تین آنہ ہے۔

بقول ہنود: نانوتویؒ مولوی کیا ہیں، اوتار ہیں:

غرض جب پارسال کے جلسہ سے اس نواح کے عام وخاص لوگوں کے دلوں پر کیا، وہ لوگ جو جلسہ میں موجود تھے اور کیا وہ جن کو راوی صحیح ملے، یہ اثر پیدا ہوا کہ مسلمانوں کے قلوب میں تو مولوی محمد قاسم صاحبؒ کی روشن تقریروں نے نور ایمان کو جلا دے دی، اور منشی پیارے لال کی بھی آنکھیں کھل گئیں، کہ جس طرف ان کی ٹکٹکی لگی ہوئی تھی، ادھر سیاہی جھلکتی نظر آنے لگی۔ اور عام ہنود کی یہ کیفیت ہوئی کہ جس گلی کوچے مولوی صاحب نکلتے تھے، اشارہ کر کے لوگ کہتے تھے کہ: وہ مولوی یہ ہے، جس نے

پادریوں کو بند کر دیا تھا اور پھسلتے کو تھام لیا تھا اور مولوی کیا ہے، اوتار ہے۔

جذبۂ خداشناسی میں اضافہ اور بار دوم کی تیاری:

تو بس اس جلسہ کے لطف نے ایسا خداشناسی کا شائق بنایا کہ یہ میلہ ہر سال کے واسطے موسم بہار میں مقرر ہوا؛ چناں چہ اب کے ۱۹/۲۰/ مارچ کو اس کا انعقاد تجویز ہو کر منشی پیارے لال نے اشتہار جا بجا بھیجے اور جو عالم پار سال شریک جلسہ ہوے تھے، ان کو بھی اور سوائے ان کے اور مشہور عالموں کو اشتہار و خطوط بھیج کر اطلاع دی، اخباروں میں بھی اشتہار چھپوایا۔ اور علاوہ اس کے یہ بھی شہرت ہوئی کہ اب کے بڑے بڑے نامی گرامی پنڈت و پادری وہاں آئیں گے۔ اور اس شہرت نے یہ اثر کیا کہ مولوی محمد قاسم اور مولوی ابوالمنصور رحمہما اللہ نے اس وجہ سے تہی دستی میں یہ مفت کی زیرباری اور بے فائدہ تضییع اوقات سے ارادہ جانے کا نہیں کیا تھا؛ مگر صرف اس خیال وشہرت سے کہ یہ مجمع بڑے بڑے بیدانیتوں اور مشاہیر کا ہوگا، مبادا ہمارے نہ جانے کو لوگ طرح دینا سمجھیں، توکل علی اللہ یہ دونوں صاحب اور دس بارہ اور بھی ان کے ساتھ کچھ شوقین، کچھ مناظرین دلی سے شاہ جہاں پور روانہ ہوے۔

شاہ جہاں پور میں حضرت نانوتویؒ کا استقبال:

۱۷/ مارچ کو یہ سب صاحب تین بجے شاہ جہاں پور میں ریل سے اترے، مولوی حفیظ اللہ خاں صاحبؒ استقبال کے واسطے ریل پر کھڑے تھے، سب کو مولانا عبدالغفور صاحبؒ کے مکان پر لے گئے اور وہ مہمان نوازی کی کہ کیا کہیے۔ ۱۸/ کو آرام کیا، جلسے کے اوقات کی نسبت یہ بات معلوم ہوئی کہ دونوں تاریخوں مذکورہ بالا میں صبح کے ساڑھے سات بجے سے گیارہ بجے تک اور ایک بجے سے چار بجے تک گفتگو ہوگی۔ ۱۹/ مارچ کو مناظرینِ اہل اسلام آخر رات سے اٹھ کر راہیٔ میدانِ

مباحثہ ہوے، جو شاہ جہاں پور سے چھ سات کوس کے فاصلہ پر تھا اور سب صاحب سوار، مولوی محمد قاسم صاحبؒ پیادہ پا طلوع آفتاب سے کچھ بعد جا پہونچے۔

حضرت نانوتویؒ میدانِ مباحثہ میں اور رجوع الیٰ اللہ:

مولوی محمد قاسم صاحبؒ نے ندی پر استنجا سے فراغت حاصل کیا اور نوافل ادا کیے اور نہایت خشوع وخضوع سے دعا مانگی۔ غالبًا وہ اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے ہوگی؛ کیوں کہ مولوی صاحب دلی سے برابر ہر شخص سے یہی فرماتے آتے تھے کہ: اُس بے نیاز سے دعا کرو، کہ کلمۂ حق غالب آئے۔

الغرض میدانِ مباحثہ کو دیکھا، تو چند خیمے استادہ ہیں؛ مگر پادری صاحبوں کا پتہ نہیں۔ حیران ہوے کہ وقت مباحثہ تو قریب آیا اور بحث کرنے والا کوئی دکھائی نہیں دیتا، خیر اہل اسلام تو اس خیمہ کے متصل جو خاص مسلمانوں کے لیے نصب ہوا تھا، درختوں کے سائے میں بیٹھ گئے، اتنے میں موتی میاں صاحب آنریری مجسٹریٹ تشریف لائے اور صاحب سلامت کر کے انتظام میلہ میں مصروف ہوے۔ جب ۹/ بجے ہوں گے، تب ایک دو پادری چلتے پھرتے نظر آئے تھے۔ غرض ساڑھے سات بجے کی جگہ دس بجے اس خیمہ میں لوگ جمع ہوے، جو مناظرہ کے لیے استادہ ہوا تھا۔

شرائط مناظرہ کی تجویز اور پادریوں کی ہٹ دھرمی:

اول تو یہ مشورہ ہوا کہ تینوں فریق میں سے چند اشخاص منتخب ہو کر علیحدہ ہو بیٹھیں اور پہلے شرائط مباحثہ تجویز کرلیں، بعد اس کے گفتگو شروع ہو۔ اہل اسلام میں سے مولوی محمد قاسم صاحبؒ اور مولوی عبد المجید صاحبؒ، پادریوں میں سے پادری نولس صاحب اور پادری واکر صاحب اور ہنود میں سے پنڈت دیانند سرسوتی اور منشی اندرمن صاحب منتخب ہوے اور موتی میاں صاحب مہتمم جلسہ بھی شریک ہوے۔

پادری نولس صاحب نے کہا کہ: ہر ایک شخص کے درس وسوال وجواب کے

واسطے ۵؍منٹ کی مدت مقرر ہو، اس پر علمائے اہل اسلام نے کہا کہ: ۵؍منٹ تھوڑے ہیں، اس میں کیا خاک فضائل مذہب واعتراض وجواب بیان ہو سکتے ہیں، ہماری رائے میں دوصورتوں میں سے ایک اختیار کرنی چاہیے:

(۱) یا تو یہ کہ مباحثہ تین دن تک اس طور سے رہے کہ ایک روز ایک مذہب والا اپنے دین کے فضائل گھنٹہ دو گھنٹہ بیان کرے اور پھر اس پر دوسرے مذہب والے اعتراض کریں، جواب سنیں۔

(۲) یا یہ ہونا چاہیے کہ درس کے لیے تو کم سے کم ایک گھنٹہ اور زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے مقرر ہوں اور سوال و جواب کے لیے دس منٹ سے بیس منٹ تک۔

سو پادری صاحبوں نے ان دونوں میں سے ایک امر کو بھی منظور نہ کیا۔ ہر چند ان سے کہا گیا کہ صاحب! پانچ منٹ میں تو کچھ بھی بیان نہیں ہوسکتا، دنیوی جھگڑے جو فروع سمجھے جاتے ہیں، ان میں ہفتوں پنچایت و بحث ہوتی ہے، یہ تحقیق مذہب پانچ منٹ میں کیوں کر ہوسکتی ہے؟ اور ہم لوگ بھی تو اس جلسہ کے ایک رکن ہیں، ہماری رائے کی رعایت بھی تو ضرور ہے۔ باوجود ہر طرح کی فہمائش کے پادری صاحبوں نے ایک نہ سنی اور پادری صاحب یہ چال چلے کہ منشی پیارے لال اور ملکتا پرشاد کو بھی رکن شوریٰ قرار دیا اور یہ کہا کہ: یہ بانی مبانی میلہ ہیں، ان کی رائے بھی لینی ضرور ہے اور وہ بوجہ توافق پنہانی اور نیز پنڈت صاحب بھی ان کی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔

ہر اکثریت معیارِ حق نہیں:

اس طور پر پادری صاحب کو یہ عمدہ بہانہ ہاتھ آیا کہ کثرت آراء کا اعتبار چاہیے۔ سب پادریوں کو خیمہ میں بلالیا اور کہا کہ اعتبار کثرتِ آراء کا چاہیے۔ غرض جس بات کو پادری نولس صاحب کہتے تھے، حضرات ہنود بھی ہاں میں ہاں ملا دیتے اور تسلیم کرتے تھے۔ ناچار مولوی صاحب یہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوے کہ آپ لوگوں کی جو رائے میں آتا

ہے، وہی کرتے ہیں، ہم سے مشورہ کرنا فضول ہے، تین گھنٹے سے ہم مغز مار رہے ہیں، آپ ایک نہیں سنتے، اب جو آپ کی رائے میں آئے، سو کیجیے، ہم ہر طرح گفتگو کرنے کو موجود ہیں، چاہے پانچ منٹ مقرر کیجیے، خواہ اس سے بھی کم۔

موتی میاں صاحب اور ادراکِ حق:

مولوی صاحبؒ جب اپنے خیمہ میں تشریف لے آئے، تو منشی پیارے لال نے چاہا کہ موتی میاں صاحب سے کچھ مشورہ کریں، موتی میاں صاحب نے ترش رو ہو کر فرمایا کہ: میں آئندہ سال شریک جلسہ نہ ہوں گا، اس کے کیا معنی کہ مسلمان جو کہتے ہیں، ان کے کہنے پر تو التفات بھی نہیں کرتے، اور پادری صاحبوں کے کہنے پر بے سوچے سمجھے ہاتھ اٹھا کر تسلیم کر لیتے ہو، یہ بات بالکل سازش اور اتفاق باہمی پر دلالت کرتی ہے۔

منشی پیارے لال کی حضرت نانوتویؒ سے معذرت:

اس کے بعد منشی پیارے لال مولوی محمد قاسم صاؒحب کے پاس آئے اور عذر و معذرت کرنے لگے کہ میں بھی مجبور ہوں، پادری صاحب میری بھی نہیں سنتے؛ البتہ آپ سے مجھ کو توقع ہے کہ آپ میری عرض قبول فرمائیں گے۔

اس پر مولوی صاحبؒ نے فرمایا کہ: خیر صاحب ہم کو تو ناچار قبول کرنا ہی پڑے گا؛ البتہ آپ سے یہ شکایت ہے کہ آپ بانئ جلسہ ہو کر عیسائیوں کی طرف داری کرتے ہیں، آپ کو سب کی رعایت برابر کرنی چاہیے۔

منشی پیارے لال نے پھر عذر کیا اور مولانا کا بہت کچھ شکریہ ادا کیا کہ آپ صاحب تو سب کچھ قبول کر لیتے ہیں، پادری صاحب بڑے ہٹ دھرم ہیں، کہ کسی کی نہیں سنتے، اگر ان کے خلاف کیا جاوے، تو چلے جانے کا اندیشہ ہے۔

اسی اثنا میں مولانا نے یہ بھی فرمایا کہ: منشی صاحب! خیر یہ تو جو ہوا، سو ہوا؛ لیکن

آپ اتنا کیجیے اور پادری صاحب سے کہیے کہ آج کا نصف دن تو اس جھگڑے میں ختم ہو گیا، اس کے عوض میں یہ کرنا چاہیے کہ ایک روز مباحثہ کے لیے اور بڑھایا جاوے اور دو کی جگہ تین دن مقرر ہوں، دوسرے یہ کہ وعظ کے لیے تیس منٹ مقرر ہوں۔

منشی پیارے لال نے اس کو تو خود تسلیم کر لیا اور پادریوں کی طرف سے یہ جواب لائے کہ پادری نولس صاحب کہتے ہیں کہ یہ دونوں امر ہم کو منظور نہیں؛ مگر میرے قیام کے لیے اگر کوئی امر مانع ہوا، تو پادری اسکاٹ صاحب جو آج آنے والے ہیں، تیسرے روز بھی ٹھہریں گے، وہ آپ سے گفتگو کریں گے۔

تقابلِ ادیان کانفرنس کے اسٹیج پر:

اس کے بعد اہل اسلام نے کھانا کھایا اور ظہر کی نماز پڑھی۔ پھر سنا کہ لوگ اب خیمۂ مباحثہ میں جانے والے ہیں، مناظرینِ اہل اسلام اس خیمہ میں داخل ہوئے، حضرات ہنود کے آنے میں کچھ دیر تھی، اور ان کے آنے سے پہلے تمام شامیانہ آدمیوں سے بھر گیا تھا۔ مناظرینِ اہل ہنود کے انتظار میں جو وقت گزرا، اس میں مولوی قاسم صاحبؒ نے پادری نولس صاحب سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ: آپ نے ہمارے بار بار کہنے سے بھی افزائش وقت کو تسلیم نہ کیا، خیر اس کو تو قبول کیجیے کہ بعد اختتام وقت جلسہ کے، یعنی چار بجے کے بعد کل ہم ایک گھنٹہ وعظ کہیں گے، آپ بھی اس محفل میں شریک ہوں، اور بعد ختم وعظ کے اعتراض کرنے کا بھی اختیار ہے؛ بلکہ جس صاحب کے دل میں آئے، وہ اعتراض کریں، ہم جواب دیں گے۔

پادری صاحب نے کہا کہ: اگر ہم بھی اسی طرح خارج وقت میں درس دیں گے، تو تم بھی سنو گے؟ مولانا نے فرمایا کہ: ضرور ہم لوگ بھی شریک ہوں گے، بشرطے کہ اعتراض کرنے کے مجاز ہوں۔ پادری صاحب نے کہا: تو اچھا ہم بھی شریک ہوں گے۔

اسی اثنا میں حضراتِ ہنود بھی آ گئے اور اس باب میں گفتگو ہوئی کہ پہلے کیا مضمون بیان ہوگا۔ باتفاق رائے یہ بات قرار پائی کہ پہلے خدا کی ذات وصفات کا بیان ہو۔ اتنے میں منشی پیارے لال بانی مبانی جلسہ نے ایک کاغذ اردو لکھا ہوا پیش کیا، کہ یہ پانچ سوال ہماری طرف سے پیش ہوتے ہیں، ان کا جواب دینا چاہیے اور وہ سوال یہ تھے:

پانچ سوالات از طرف بانیٔ جلسہ:

سوال اول: دنیا کو پرمیشر نے کس چیز سے بنایا اور کس وقت اور کس واسطے؟

سوال دوم: پرمیشر کی ذات محیط کل ہے، یا نہیں؟

سوال سوم: پرمیشر عادل ہے اور رحیم ہے، دونوں کس طرح ہے؟

سوال چہارم: وید اور بائبل اور قرآن کے کلام الٰہی ہونے میں کیا دلیل ہے؟

سوال پنجم: نجات کیا چیز ہے اور کس طرح حاصل ہو سکتی ہے؟

میدانِ مباحثہ میں انبوہِ شائقین:

اہل جلسہ نے ان سوالوں کے جواب دینے کو قبول کیا؛ لیکن انبوہِ شائقین اس قدر ہو گیا تھا کہ شامیانے میں نہ بیٹھنے کی جگہ تھی، نہ کھڑے ہونے کی؛ اس لیے یہاں سے جلسہ پھرا کھڑا، اور شامیانے سے باہر میدان میں فرش ہوا، بیچ میں میز بچھائی گئی اور اس کے متصل ایک تخت، جس پر واعظ، خواہ معترض یا مجیب کھڑا ہو کر تقریر کرے، اور گرداگرد کرسیاں اور صندلیاں بچھائی گئیں۔

کرسیوں پر علمائے اسلام اور پادری لوگ اور پنڈت اور منتظم جلسہ اور تحریر کرنے والے بیٹھے، باقی سب فرش پر، اور فرش کے گرد عام لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ کھڑے ہوے۔ جب مجلس جم گئی، تو اس میں گفتگو ہوئی کہ پہلے کون اس سوالوں کے جواب دینے شروع کرے گا؟

پادریوں اور پنڈتوں کی پہلوتہی:

پنڈت صاحبوں سے کہا گیا کہ محفلِ شوریٰ میں آپ کہہ چکے ہیں کہ آج ہم درس دیں گے۔سو آپ بیان کریں۔انہوں نے پہلوتہی کی، پادری نولس صاحب جب ان سے اصرار کر چکے،تو مولوی محمد قاسم صاحبؒ کی طرف متوجہ ہوئے،مولانا نے فرمایا کہ: ہمیں کچھ عذر نہیں؛ مگر انصاف مقتضی اسی کا تھا کہ سب کے بعد ہم بیان کرتے؛ کیوں کہ دین بھی ہمارا سب سے پچھلا ہے۔

اس پر پادری صاحب نے پنڈت دیانند سرسوتی صاحب سے کہا کہ: آپ کیوں نہیں کہتے؟ انہوں نے جواب دیا کہ: اچھا میں کہتا ہوں؛ مگر جب اور سب بیان کر چکیں گے،تو میں پھر بیان کروں گا؛ ورنہ میرا بیان سب سے ماضی پڑ جائے گا۔

غرض اس ردوکد میں چار بج گئے،تو پادری صاحب نے مولوی صاحب سے کہا کہ: اچھا مولوی صاحب! آپ اپنا وعظ کل کی جگہ آج ہی کہہ ڈالیے۔کل پہلے پنڈت صاحب ان سوالوں کا جواب دیں گے۔

حضرت نانوتویؒ اور سبقت فی البیان:

مولوی صاحب نے فرمایا کہ: بہت اچھا! مجھے تو سوالوں کے جواب دینے میں آج بھی عذر نہیں، آپ خود ہی ایک دوسرے پر حوالہ کرتے ہیں اور نہ کوئی وعظ کی حامی بھرتا ہے، نہ جوابوں کی۔خیر اب سب صاحب ذرا توقف کریں، ہم نماز عصر پڑھ لیں، آج وعظ کی بھی ابتدا ہم ہی کرتے ہیں اور کل جواب بھی پہلے ہم ہی دیں گے اور جس صاحب کے جی میں آئے، وہ اعتراض کرے۔یہ کہہ کر مولانا نماز پڑھ آئے اور کھڑے ہوکر ایسا زوروشور کا وعظ کہا کہ تمام جلسہ حیران رہ گیا اور ہر شخص پر ایک سکتے کا عالم تھا۔اس وعظ کی تقریر یہ ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وعظ

تمہید بلیغ:

اے حاضرینِ جلسہ! یہ کمترین بغرض خیر خواہی کچھ عرض کیا چاہتا ہے، سب صاحب بگوشِ ہوش سنیں! میری یہ گزارش بنظر خیر خواہی دنیا نہیں، بلحاظ خیر اندیشی دین اور اخرت ہے۔ غرض اصلی میری یہ ہے کہ وہ عقائد واحکام، جن کو عقائد دینی اور احکام خداوندی سمجھتا ہوں، سب حاضرانِ جلسہ کو بالاجمال سناؤں اور اس لحاظ سے مجھ کو یہ وہم ہے کہ شاید حاضرانِ جلسہ میری بدافعالی اور خستہ حالی پر نظر کر کے میری گزارش پر کچھ دل نہ لگائیں اور دل میں یہ فرمائیں: ''خودرا فضیحت، و دیگراں را نصیحت''؛ مگر اہل عقل خود جانتے ہوں گے کہ طبیب کا بد پرہیز ہونا مریض کو مضر نہیں۔ اسی طرح اگر میں خود اپنے کہنے پر عمل نہ کروں اور دوسروں کو سمجھاؤں، تو دوسروں کا کیا نقصان ہے، جو میری گزارش کو قبول نہ فرمائیں۔

علی ہذا القیاس منادی کرنے والے کا بھنگی ہونا حکام دنیا کے احکام قبول کرنے اور تسلیم کرنے کو مانع نہیں، اس کو کوئی نہیں دیکھتا کہ سنانے والا بھنگی ہے۔ غریب ہوں، یا امیر، عام لوگ ہوں، یا نواب؛ بھنگی کی زبان سے احکامِ بادشاہی سن کر سر نیاز خم کر دیتے ہیں۔ جب حکام دنیا کے احکام کی اطاعت میں یہ حال ہے، تو احکم الحاکمین

خداوند رب العالمین کے احکام کی اطاعت میں بھی میری خستہ حالی پر نظر نہ کیجیے۔اس سے بھی کیا کم کہ مجھ کو بھی بمنزلۂ ایک بھنگی کے سمجھیے۔غرض مجھ کو نہ دیکھیے،اس کو دیکھیے کہ میں کس کے احکام سناتا ہوں اور کس کی عظمت اور شان سے مطلع کرتا ہوں۔

وجودِ انسانی اولین تفکیر کا مرکز:

وہ بات جو سب میں اولیٰ لائق توجہ و اطلاع ہے، اپنے وجود کی کیفیت ہے، کون نہیں جانتا کہ سب میں اول آدمی کو اپنی ہی اطلاع ہوتی ہے اور سوا اپنے جس چیز کو جانتا ہے، اپنے بعد جانتا ہے؛؟ اس لیے سب میں اول لائق توجہ تام اور درباۂ علم قابلِ اہتمام بھی اپنے ہی وجود کی کیفیت ہے؛ مگر اپنے وجود کی کیفیت یہ ہے کہ دائم وقائم نہیں۔ایک زمانہ وہ تھا کہ ہم پردۂ عدم میں مستور تھے، اور اس کے بعد یہ زمانہ آیا کہ ہم موجود کہلائے اور طرح طرح کے آثار وجود ہم سے ظہور میں آئے۔اور پھر اس کے بعد ایک ایسا زمانہ آنے والا ہے کہ یہ ہمارا وجود ہم سے مثل سابق علی حدہ ہو جائے گا، اور ہمارا ذکر جانے دو، ہم سے پہلے اور ہمارے سامنے کس قدر غیر محدود بنی آدم وغیرہم وجود میں آکر معدوم ہو گئے۔

ہر شئ دو عدموں کے بیچ اور ایک وجودِ مطلق کی طلب گار:

غرض زمانۂ وجود بنی آدم وغیرہم دو عدموں کے بیچ میں ایک زمانۂ محدود ہے۔ اس انفصال واتصال، وآمد وشد وجود سے یہ نمایاں ہے کہ ہمارا وجود مثل نورِ زمین، جس کو دھوپ یا چاندنی کہتے ہیں اور مثل حرارتِ آبِ گرم صفت خانہ زاد نہیں؛ بلکہ عطائے غیر ہے؛ لیکن جیسے نورِ زمین اور حرارت اور آبِ گرم کا سلسلہ آفتاب اور آتش پر ختم ہو جاتا ہے؛ اس لیے بہ نسبت آفتاب وآتش کوئی شخص یہ خیال نہیں کر سکتا کہ عالم اسباب میں آفتاب وآتش میں کسی اور کا فیض ہے؛ بلکہ ہر شخص یہی خیال کرتا ہے کہ آفتاب وآتش میں نور وحرارت خانہ زاد ہے۔اور اس لیے ہر حال میں نور وحرارت

آفتاب و آتش کو لازم و ملازم رہتے ہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ مثل نور زمین و حرارتِ آب، آفتاب و آتش سے بھی نور و حرارت منفصل ہو جائے۔ ایسے ہی یہ بھی ضرور ہے؛ بلکہ اس سے بھی زیادہ ضرور ہے کہ ہمارے تمہارے وجود کا سلسلہ کسی ایسے موجود پر ختم ہو جائے، جس کا وجود اس کے ساتھ ہر دم لازم و ملازم رہے اور اس کا وجود اس کے حق میں خانہ زاد ہو، عطائے غیر نہ ہو، ہم اسی کو ''خدا'' کہتے ہیں اور اسی لیے کہتے ہیں کہ اس کا وجود عطائے غیر نہیں، خود اسی کا ہے۔

کسی شئ کا وجود مشہود نہ ہونا قدامت کی دلیل نہیں:

جب ہماری نسبت بوجہ ناپائداری وجود خدا کا ہونا ضروری ہی ٹھہرا، تو اب ان اشیا کی نسبت بھی اس بات کا دریافت کرنا ضروری ہے، جس کا وجود بظاہرِ نظر پائدار نظر آتا ہے۔ جیسے زمین و آسمان، دریائے شور، ہوا، چاند و سورج، ستارے کہ نہ کسی نے ان کا عدم سابق دیکھا اور نہ اب تک عدم لاحق کی ان کو نوبت آئی؛ اس لیے یہ گزارش ہے کہ زمین و آسمان وغیرہا اشیائے مذکورہ کو ہم دیکھتے ہیں کہ مثل اشیائے ناپائدار ان میں بھی دو دو باتیں ہیں:

(۱) ایک تو یہی وجود اور ہستی، جو تمام اشیا میں مشترک معلوم ہوتا ہے۔

(۲) دوسرے: وہ بات جس سے ایک دوسرے سے متمیز ہے اور جن کے وسیلے سے ایک کو دوسرے سے پہچان لیتے ہیں اور دیکھتے ہی سمجھ لیتے ہیں کہ یہ فلانی چیز ہے۔

اس چیز کو ہم حقیقت کہتے ہیں اور پھر یہ کہتے ہیں کہ وجود اور حقیقت دونوں باہم ایسا رابطہ نہیں رکھتے کہ ایک دوسرے سے جدا ہی نہ ہو سکے۔ اور مثل اثنین اور زوجیت۔ یعنی دو اور جفت ہونے کی ایک دوسرے کے ساتھ ایسے مربوط اور متلازم نہیں کہ ایک دوسرے کا کسی طرح پیچھا ہی نہ چھوڑے۔ عدد اثنین سے اس کی زوجیت نہ خارج میں اس سے جدی ہو، اور نہ ذہن میں علی حدہ ہو۔ علی ہذا القیاس زوجیت سے

عدد اثنین علی حدہ نہیں ہوتا۔

چار اور چھ اور آٹھ وغیرہ اعداد میں بھی اگر زوجیت پائی جاتی ہے، تو اس دو کے عدد کی بدولت پائی جاتی ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ زوجیت کے معنی یہی ہیں کہ دو ٹکڑے صحیح بلا کسر برابر نکل آئیں اور ظاہر ہے کہ یہ بات یعنی دو ٹکڑوں کا برابر نکل آنا اس پر موقوف ہے کہ عدد مفروض چند اثنین، یعنی چند دو کا مجموعہ ہو۔ غرض اثنین اور زوجیت میں طرفین سے تلازم ہے، نہ یہ اس سے جدا ہو سکے اور نہ وہ اس سے علی حدہ ہو سکے، نہ ذہن میں، نہ خارج میں۔

وجود کا خانہ زاد ہونا غیر معدوم ہونے کی دلیل:

اور ظاہر ہے کہ اس قسم کا ارتباط اشیائے مذکورہ کے وجود اور ان کے حقائق میں ہر گز نہیں۔ یہ نہیں کہ جیسے: اثنین اور زوجیت کی جدائی کسی کی عقل میں نہیں آسکتی۔ ایسے ہی اشیائے مذکورہ کے وجود اور حقائق کی جدائی کسی کی عقل میں نہ آسکے۔ چناں چہ ظاہر ہے کہ آسمان وزمین کا معدوم ہو جانا عقل میں آسکتا ہے، ہاں خود وجود اور اس ذات کا معدوم ہو جانا، جو صفت وجود کے حق میں ایسی ہو، جیسے زوجیت کے حق میں اثنین؛ البتہ عقل میں نہیں آسکتا۔ کون نہیں جانتا کہ وجود کا معدوم ہو جانا ایسا ہے، جیسا خود نور کا نور ہو کر کالا سیاہ ہو جانا، اندھیرا بن جانا۔ اور جب وجود قابلِ عدم نہیں، تو پھر وہ ذات وجود کی بھی اصل ہے اور وجود اس کے حق میں خانہ زاد ہے؛ کیوں کر معدوم ہو سکے۔

وجود کا خانہ زاد نہ ہونا معدوم ہونے کی دلیل:

الحاصل وجود زمین وآسمان ان کے حقائق سے علی حدہ ہیں اور اس لیے یوں نہیں کہہ سکتے کہ ان کا وجود ان کا خانہ زاد ہو، اور جب خانہ زاد نہیں، تو پھر بے شک عطائے غیر ہوگی اور قبل عطا ان کا معدوم ہونا ثابت ہوگا، جس سے ان کے وجود کے لیے ایک

ابتدا نکل آئے گی اور ان کی قدامت باطل ہو جائے گی۔ گو وہ ابتدا تمام بنی آدم کے موجود ہونے سے سابق ہو، اور اس لیے اپنے آپ ہم میں سے کسی کو اس کی اطلاع نہ ہوئی ہو، اور اسی طرح ان کا پھر معدوم ہو جانا ممکن ہوگا؛ کیوں کہ جب وجود اشیائے مذکور مثل نور زمین اور حرارت آب گرم عطائے غیر ہوگا، تو مثل نور زمین اور حرارت آب ان کا پھر جدا ہو جانا بھی ممکن ہوگا؛ مگر جب وجود اشیائے مذکورہ بھی عطائے غیر نکلا، تو بے شک حسبِ بیانِ سابق اس غیر کا وجود، جس کی یہ عطا ہے، اس کا خانہ زاد ہوگا اور اس لیے اس کا وجود اس سے کبھی علی حدہ نہ تھا، نہ آئندہ علی حدہ ہوگا۔ غرض ہمیشہ سے اس کا وجود تھا اور ہمیشہ تک رہے گا۔

وجودِ خانہ زاد میں تعدد ناممکن اور وحدانیت ناگزیر:

اب یہ بات دیکھنی باقی رہی کہ اس قسم کا موجود، جس کا وجود اس کا خانہ زاد ہو، ایک ہی ہے، یا متعدد ہیں؟ اور ایک ہے، تو اس سے زیادہ ممکن ہے، یا محال ہے؟؛ اس لیے یہ گزارش ہے کہ جیسے سیاہی، سفیدی، انسانیت، حیات وغیرہ اوصاف کے احاطہ میں قلیل وکثیر اشیا داخل ہیں۔ یعنی بہت سی اشیا سفید ہیں، بہت سی سیاہ، بہت سے انسان ہیں، بہت سے حیوان۔ ایسے ہی وجود کے احاطہ میں بھی یہی حال ہے؛ لیکن سب اوصاف کے احاطہ سے، احاطۂ وجود وسیع ہے؛ بلکہ اس سے اوپر کوئی احاطہ ہی نہیں۔ یعنی جیسے انسانیت کے احاطہ سے اوپر احاطۂ حیات ہے، جس میں انسان غیر انسان، گھوڑا، گدھا، اونٹ، بیل، بھیڑ، بکری وغیرہا سب داخل ہیں۔ ایسے ہی وجود کے احاطے سے اوپر کوئی اور ایسا احاطہ نہیں، کہ اس میں موجود، غیر موجود داخل ہو؛ کیوں کہ غیر موجود اگر ہو، تو معدوم ہی ہوگا۔ اور ظاہر ہے کہ معدوم کسی وصف کے احاطے میں داخل ہی نہیں؛ کیوں کہ ہر وصف کے حاصل ہونے کے لیے اول وجود کا ہونا ضروری ہے۔ چناں چہ ظاہر ہے؛ مگر جب وجود کا احاطہ سب احاطوں سے وسیع اور سب میں اوپر ہے، تو

بالضرور وجود ایک وصف غیر محدود ہوگا؛ کیوں کہ ہر محدود کے لیے یہ ضرور ہے کہ وہ کسی ایسی وسیع چیز کا ٹکڑا ہوگا، یا ایسی چیز میں سمائی ہوئی ہو، جو اس سے زیادہ ہو۔ مثلاً: ہر مکان اور محلّہ اور شہر، ضلع، ولایت وغیرہ محدود چیزیں ہیں؛ لیکن ان کے محدود ہونے کے یہی معنی ہیں کہ یہ سب چیزیں زمین کے قطعات ہیں، جو ان چیزوں سے زیادہ وسیع ہے۔ اور زمین وآسمان اگر محدود ہیں، تو اس کے یہ معنی ہیں کہ اس فضائے وسیع میں جو آنکھوں سے نظر آتا ہے، سمائی ہوئی ہیں۔

الغرض اگر وجود کو محدود کہیے، تو یہ ضرور ہے کہ وہ کسی وسیع چیز کا ٹکڑا ہو، یا کسی وسیع چیز میں سمایا ہوا ہو؛ مگر وہ کون ہے، جو نہیں جانتا کہ وجود سے زیادہ کوئی وسیع چیز نہیں۔ تمام اشیاء وجود کے احاطہ میں داخل ہیں، پر وجود کسی کے احاطہ میں داخل نہیں؛ اس لیے خواہ مخواہ اس بات کا اقرار کرنا ضرور ہے کہ وجود غیر محدود ہے۔

تنقیح وحدانیت بالامثال:

جب یہ بات ذہن نشیں ہو چکی، تو اب یہ خیال فرمائیے! کہ نہ احاطۂ وجود میں خدا کا ثانی ہو سکتا ہے اور نہ وجود کے احاطہ سے خارج اس کا ثانی ممکن ہے۔ احاطۂ وجود میں محال ہونے کی وجہ تو یہ ہے کہ جب ہمارا تمہارا وجود باوجود اس ضعف کے جو اس کے عطائے غیر ہونے سے نمایاں ہے، غیر کو اپنے احاطہ میں گھسنے نہیں دیتا، خدا کا وجود اس قوت پر کہ اس کا خانہ زاد ہونا اس کی دلیل ہے؛ کیوں کر اپنے ثانی کو اپنے احاطہ میں قدم رکھنے دے گا۔

القصہ جیسے ہم تم جہاں تک پھیلے ہوے ہوتے ہیں، وہاں تک اور دوسرا نہیں آسکتا اور آجائے، تو پھر ہم وہاں نہیں رہ سکتے۔ علی ہذا القیاس ایک میان میں دو تلواریں نہیں آتیں اور سیر بھر کے برتن میں دو سیر غلہ نہیں سما سکتا۔ ایسے ہی؛ بلکہ اس سے بڑھ کر خدا کے احاطہ میں خدا کے ثانی کا آنا اور سمانا سمجھیے؛ کیوں کہ آفتاب کے نور

کے مقابلہ میں، جو اس کی ذات کے ساتھ چسپاں نظر آتا ہے، یہ دھوپ برائے نام نور ہے، اور نہایت ہی درجہ کو ضعیف ہے۔ ایسے ہی بمقابلہ خدا کے وجود کے جو اس کی ذات کے ساتھ لازم وملازم ہے، مخلوقات یعنی اور اشیاء کا وجود برائے نام وجود ہے اور نہایت ہی درجہ کو ضعیف ہے؛ مگر اس ضعف پر ہمارے وجود میں یہ قوت ہے کہ غیر کو اپنی سرحد میں قدم رکھنے نہیں دیتا، تو خدا کا جو داس قوت پر کا ہے کو اور کسی خدا کی مداخلت کا روادار ہوگا۔ اور خارج از احاطہ خدا ثانی کے نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ احاطۂ وجود غیر محدود اس کے سوا اور اس سے باہر کوئی جگہ ہی نہیں، جو کسی دوسرے کے ہونے کا احتمال ہو؛ اس لیے اس بات کا اقرار ہر عاقل کے ذمہ ضرور ہے کہ خالق کائنات کو ایک ذات وحدہ لاشریک لہ سمجھے اور احتمال تعدد کو دل سے اٹھا دھرے۔

بطلانِ تثلیث اظہر من الشمس:

اسی تقریر سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ مسئلۂ تثلیث جس پر مدار کارِ ایمانِ نصاریٰ فی زماننا ہے، سراسر غلط ہے، وہاں تعدد کی گنجائش ہی نہیں، جو تثلیث تک نوبت پہونچے اور پھر وہ بھی اس طرح کہ باوجود تعدد حقیقی وحدت حقیقی باقی رہے؛ کیوں کہ وحدت اور کثرت دونوں باہم ضد یک دیگر ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اجتماع ضدین محال ہے۔ جیسے یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک آن میں ایک شئی سیاہ بھی ہو، سفید بھی ہو، گرم بھی ہو، سرد بھی ہو، یا ایک وقت میں ایک جگہ دن بھی ہو، رات بھی ہو، دوپہر بھی ہو، آدھی رات بھی ہو، ایک شخص ایک وقت میں عالم بھی ہو، جاہل بھی ہو، بیمار بھی ہو، تندرست بھی ہو، موجود بھی ہو، معدوم بھی ہو۔ ایسے ہی یہ بھی نہیں ہوسکتا کہ خدا تعالیٰ ایک بھی ہو، اور تین بھی ہو، وحدت بھی حقیقی ہو، اور کثرت بھی حقیقی ہو۔

احتیاج قدرتِ مطلقہ کے منافی:

علی ہذا القیاس جیسے اضداد مذکورہ کا احتمال محال ہے، ایسے ہی خدائی اور احتیاج

کا اجتماع بھی محال ہے؛ کیوں کہ خدائی کو استغنا ضرور ہے۔ آفتاب تو فقط اس وجہ سے کہ زمین کی نسبت معطیٔ نور ہے، نور میں زمین کا محتاج نہ ہو۔ خداوند عالم باوجودیکہ تمام عالم کے حق میں معطیٔ وجود ہے، عالم کا یا عالم میں سے کسی کا محتاج ہو؛ کیوں کہ ہر چیز وصف ہو، یا موصوف ہو؛ اپنی ہستی میں خدا کا محتاج ہے۔ پھر کیوں کر ہو سکتا ہے کہ خداوند عالم کسی بات میں کسی کا محتاج ہو، جس چیز میں خدا کو محتاج کہیے گا، اس سے پہلے اس چیز کو خدا کا محتاج کہنا پڑے گا۔ اور ظاہر ہے کہ احتیاج کے یہی معنی ہیں کہ اپنے پاس ایک چیز نہ ہو، اور جس کی طرف احتیاج ہو، اس کے پاس وہ چیز موجود ہو۔ جب ہر بات میں ہر چیز کو خدا کا محتاج مانا، جو کچھ جہاں میں احتیاج کے قابل ہوگا، خداوند عالم میں وہ پہلے ہوگا۔ ہاں خود احتیاج اور سامان احتیاج اس میں نہ ہوں گے۔

محتاج کا خدا ہونا عقل و انصاف کے خلاف:

علیٰ ہذا القیاس یہ بھی ظاہر ہے کہ خود محتاج کا اس پر کسی قسم کا دباؤ نہیں ہو سکتا، جس کا خود محتاج ہے۔ ہاں معاملہ بالعکس ہوا کرتا ہے۔ یعنی ہمیشہ محتاج پر اس کا دباؤ رہ سکتا ہے، جس کا محتاج ہوتا ہے؛ اس لیے یہ ضرور ہے کہ نہ خدا تعالیٰ میں کسی قسم کا احتیاج ہو، نہ اس پر کسی قسم کا دباؤ ہو، اس کا وجود ہمیشہ سے ہو، اور ہمیشہ کو رہے۔ یہ نہ ہو کہ اس کے وجود کے لیے ابتدا، انتہا ہو، اس صورت میں کیوں کر کہہ دیجیے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام، یا شری رام چندر وغیرہ خدا تھے۔ ان کے وجود کی ابتدا اور انتہا معلوم، کھانے پینے کا محتاج ہونا اور پاخانہ پیشاب، مرض اور موت کا دباؤ، سب پر آشکارا، ایسی ایسی چیزوں کی احتیاج اور ایسی ایسی چیزوں کے دباؤ کے بعد بھی خدائی کا اعتقاد عقل اور انصاف سے سراسر بعید ہے۔

خداوند عالم تمام صفات کا مصدر و منبع:

اس کے بعد پھر یہ گزارش ہے کہ وہ خداوند عالم جیسے اپنی ذات میں یکتا اور وحدہ

لاشریک لہ ہے، ایسے ہی جامع کمالات وصفات بھی ہے۔ اور کیوں نہ ہو، عالم میں جس صفت کو دیکھیے، اپنے موصوف کے حق میں وجود کی تابع ہے۔ یعنی قبل وجود کسی صفت کا ثبوت ممکن نہیں۔ رہا امکان اور عدم واقع میں یہ دونوں باتیں وصف نہیں؛ بلکہ سلب وصف ہیں، عدم میں تو ظاہر ہے سلب وجود ہوتا ہے، رہا امکان، اس میں سلب ضرورتِ وجود ہوتا ہے۔ اور عام لوگوں کے محاورہ کے موافق امکان کا استعمال قبل وجود ہی ہوتا ہے۔ جب یوں بولتے ہیں کہ: یہ چیز ممکن ہے، تو ہر کوئی یہی سمجھتا ہے کہ یہ چیز بالفعل موجود نہیں؛ مگر ہاں جیسے سایہ، جو واقع میں عدم النور ہے، بوجہ غلطی ایک چیز نظر آتی ہے۔ ایسے ہی عدم اور امکان بھی بوجہ غلط فہمی اوصاف معلوم ہوتے ہیں؛ مگر جب تمام اوصاف اپنے ثبوت وحصول میں وجود کے محتاج ہوے، تو بے شک یہی کہنا پڑے گا کہ تمام اوصاف اصل میں وجود کے اوصاف ہیں۔ یعنی وجود کے حق میں عطائے غیر نہیں؛ بلکہ تمام اوصاف یعنی کمالات وجودی وجود کے حق میں خانہ زاد ہیں؛ ورنہ جیسے نور زمین اور گرمی آبِ گرم زمین اور پانی سے علی حدہ ہوکر بھی پائی جاتی ہیں۔ ایسے ہی اوصاف وجودی بھی وجود سے علیٰ حدہ ہوکر پائے جاتے ہیں۔

اس صورت میں بالضرور جو منبع وجود ہوگا، وہی منبع اوصاف بھی ہوگا۔ پھر جہاں جہاں وجود ہوگا، وہاں وہاں تمام اوصاف بھی قلیل اور کثیر ضرور ہوں گے۔ اگر فرق ہوگا، تو ایسا ہوگا، جیسا آئینہ اور پتھر میں فرق ہے۔ یعنی بوجہ فرق حسن قابلیت وعدم حسن قابلیت آئینہ میں بہ نسبت پتھر کے زیادہ نور آجاتا ہے؛ اس لیے ضرور ہے کہ تمام کائنات میں علم وادراک وقوت وحس وحرکت قلیل وکثیر ضرور ہو، تو یہ ہو، کہ انسان وغیرہ میں علم وادراک زیادہ ہو، اور حیوانات میں اس سے کم، اور نباتات میں ان سے کم، اور جمادات یعنی زمین وآسمان، اینٹ پتھر وغیرہ میں ان سے بھی کم۔ یا فرض کیجیے معاملہ بالعکس ہو؛ مگر یہ نہیں ہوسکتا کہ زمین، پہاڑ، اینٹ، پتھر علم وادراک اور قوت

حرکت سے بالکل خالی ہوں۔ باقی رہا ہم کو نہ معلوم ہونا، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ اوصاف نہ ہوں؛ چناں چہ ظاہر ہے۔

بہر حال! خداوند عالم؛ بلکہ تمام عالم میں تمام کمالات کا ہونا ضروری ہے اور تمام کائنات کا وجود اور کمالات میں خداوند عالم کا محتاج ہونا لابدی ہے؛ اس لیے یہ بھی ضروری ہے کہ خداوند عالم تمام عالم کے حق میں واجب الاطاعت ہو، اور تمام عالم کے ذمہ اس کی اطاعت اور فرمانبرداری واجب و لازم ہو؛ کیوں کہ وجوہِ فرمانبرداری بظاہر کل تین ہیں اور حقیقت میں دو ہیں۔

اطاعت وفرماں برداری کے اسباب ووجوہات:

اور تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ کوئی کسی کی تابع داری یا امیدِ نفع پر کرتا ہے۔ جیسے نوکر اپنے میاں کی تابع داری تنخواہ کی امید پر کرتا ہے، اندیشۂ نقصان کے باعث اس کی فرمانبرداری کرتا ہے۔ جیسے رعیت حکام کی اطاعت اور مظلوم ظالم کی تابع داری کیا کرتے ہیں۔ یا بوجہ محبت کوئی کسی کی تابع داری کیا کرتا ہے۔ جیسے عاشق اپنے معشوقوں کی تابع داری کیا کرتے ہیں؛ مگر امید واندیشہ کو دیکھیے، تو اختیار نفع ونقصان کی طرف راجع ہیں، جس کے اصل کو ٹٹولیے، تو مالکیت اوصاف وکمالات نکلتے ہیں۔ یعنی مالک اصلی کو اختیار رد واسترداد اوصاف وکمالات ہوتا ہے اور مستعیر کو اختیار رد وانکار نہیں ہوتا۔ چناں چہ آفتاب وزمین کے حال سے نمایاں ہے کہ آفتاب وقت طلوع زمین کو نور عطا کرتا ہے، تو زمین اس کو رد نہیں کرسکتی، اور وقت غروب اس نور کو آفتاب چھین لیتا ہے، تو زمین سے انکار نہیں ہوسکتا۔ وجہ اس کی بجز اس کے اور کیا ہے کہ آفتاب مالک النور ہے اور زمین فقط مستعیر ہے۔

اسباب اطاعت کی دقیق تنقیح:

الحاصل وجوہِ فرمانبرداری اور اسبابِ اطاعت بظاہر تین ہیں: ”امید نفع،

اندیشۂ نقصان، محبت‘‘۔اور حقیقت میں کل دو سبب ہیں: ایک مالکیت، دوسری محبت۔ اور اس سے زیادہ تنقیح کیجیے، تو اصل سبب اطاعت محبت ہے۔ اتنا فرق ہے کہ کہیں محبت مطاع موجب اطاعت ہوتی ہے اور کہیں محبت مال و جان باعثِ فرمانبرداری ہوجاتی ہے۔ عشاق کی اطاعت اور فرمانبرداری میں خود مطاع کی محبت باعث اطاعت ہوتی ہے اور نوکر کی اطاعت میں محبت مال و جان۔ علی ہذا القیاس رعیت کی اطاعت میں محبت جان و مال موجب فرمانبرداری ہوتی ہے؛ مگر ہر چہ بادا باد وجہ ایک ہو، یا دو ہوں، یا تین، جو کچھ ہو، وہ خدا میں اول ہے، اوروں میں اس کے بعد؛ کیوں کہ مالکیت اور اختیار نفع ونقصان بھی ہستی اور وجود پر موقوف ہے،، جہاں وجود اور ہستی کی اصل ہوگی، وہیں مالکیت اور اختیار مذکور اور جمال ومحبوبیت بھی ہوں گی۔ مثل وجود مالکیت اور اختیار محبوبیت بھی اوروں میں اسی کی عطا ہوگی اور اسی کا فیض ہوگا۔ جب مخلوقات میں وجوہِ مذکورہ سرمایۂ اطاعت ہیں، تو خداوند عالم کے حق میں یہ باتیں کیوں کر سامانِ اطاعت وفرمانبرداری نہ ہوں گی۔

القصہ جب اسباب طاعت وفرمانبرداری سب کے سب خداوند عالم میں موجود ہیں اور وہ بھی اس طرح کے اوروں میں اس قسم کی چیز اگر ہے، تو اسی کا فیض ہے۔ تو بے شک خدواند عالم تمام عالم کے حق میں واجب الاطاعت ہوگا؛ لیکن اطاعت وفرمانبرداری اور تابع داری اس کو کہتے ہیں کہ دوسروں کی مرضی کے موافق کام کیا جائے؛ ورنہ خلاف مرضی کرنے پر بھی طاعت و بندگی اور فرمانبرداری ہی رہی، تو پھر گناہ وخطا اور طاعت و بندگی میں کیا فرق رہے گا۔

اطاعت کے لیے توافقِ رضا اور مخبرانِ رضائے حق کی ضرورت:

الحاصل اطاعت کے لیے توافق رضا ضرور ہے؛ لیکن رضا اور عدم رضا کا حال یہ

ہے، کہ ہم باجودیکہ سراپا ظاہر ہیں، ہماری مرضی، عدم مرضی ایسی مخفی ہے کہ بے ہمارے اظہار کے ظاہر نہیں ہوسکتی، بے ہمارے بتلائے کسی کو اطلاع نہیں ہوسکتی، بے ہماری تصریح، یا اشارہ، کنایہ کے کسی کو اس کی خبر نہیں ہوسکتی۔ اس صورت میں اس خداوند عالم کی مرضی، عدم مرضی اس پوشیدگی پر کہ آج تک خدا تعالیٰ کو کسی نے دیکھا ہی نہیں، بے خدا کے بتلائے کیوں کر کسی کو اطلاع ہوسکتی ہے؛ لیکن بادشاہانِ دنیا ومحبوبانِ دارِ فنا کو ہم دیکھتے ہیں کہ اس نام کی مالکیت ومحبوبیت اور ذرا سے سامانِ نخوت پر مکان مکان اور دکان دکان اپنے مطیعوں سے کہتے نہیں پھرتے کہ یہ بات ہماری موافق مرضی ہے، اس کی تعمیل کرنی چاہیے اور یہ بات خلاف مرضی ہے، اس سے احتراز لازم ہے؛ مقربانِ درگاہ ان کے ارشادات اور اشارات کے موافق اوروں کو مطلع کردیا کرتے ہیں اور حسب ضرورت اشتہار و منادی کرادیتے ہیں۔

اس صورت میں خداوند عالم کو اس سامانِ بے نیازی پر کہ وہ کسی کا کسی بات میں محتاج نہیں، اور سوا اس کے سب اس کی سب باتوں میں محتاج۔ کب سزاوار ہے کہ ہر کسی سے کہتا پھرے کہ اس کام کو کرنا چاہیے اور اس کام کو نہ کرنا چاہیے۔ وہ بھی اپنے مقربانِ خاص کے ذریعہ سے اوروں کو اپنی رضا وغیر رضا سے مطلع کرے گا۔ ہم انہیں مقربوں کو جو خداوند عالم کے ارشادات کی اطلاع اوروں کو کرتے ہیں ''پیغمبر'' اور ''نبی'' اور ''رسول'' کہتے ہیں۔

وجہ تسمیہ خود ظاہر ہے؛ لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ کوئی کسی کا مقرب جب ہی ہوسکتا ہے، جب کی اس کی موافق مرضی ہو، جو لوگ مخالف مزاج ہوتے ہیں، قرب منزلت ان کو میسر نہیں آسکتا۔ چناں چہ ظاہر ہے؛ مگر یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص یوسف ثانی اور حسن میں لاثانی ہو، پر اس کی ایک آنکھ مثلاً کانی ہو، تو اس ایک کا نقصان تمام چہرہ کو بدنما اور ناز یبا کردیتا ہے۔ ایسے اگر ایک بات بھی کسی میں دوسرے کے مخالف مزاج

ہو، تو ان کی اور خوبیاں ہوئی نہ ہوئی برابر ہو جائیں گی۔

عصمتِ انبیاء:

غرض ایک عیب بھی کسی میں ہوتا ہے، تو پھر محبوبیت اور موافق طبیعت و رضا متصور نہیں، جو امید تقرب ہو؛ اس لیے یہ بھی ضرور ہے کہ انبیاء اور مرسل سراپا اطاعت ہوں اور ایک بات بھی ان میں خلاف مرضی خداوندی نہ ہو، اسی وجہ سے ہم انبیاء کو معصوم کہتے ہیں۔ اور اس کہنے سے یہ مطلب ہوتا ہے کہ ان میں گناہِ خداوند عالم کا مادہ اور سامان ہی نہیں؛ کیوں کہ ان میں جب کوئی صفت بُری ہی نہیں، تو پھر ان سے بُرے افعال کا صادر ہونا بھی ممکن نہیں؛ اس لیے کہ افعال اختیاری تابع صفات ہوتے ہیں۔ اگر سخاوت ہوتی ہے، تو داد و دہش کی نوبت آتی ہے اور اگر بخل ہوتا ہے، تو کوڑی کوڑی جمع کی جاتی ہے۔ شجاعت میں معرکہ آرائی اور بزدلی میں پس پائی ظہور میں آتی ہے۔

ہاں یہ بات ممکن ہے کہ بوجہ سہو، یا غلط فہمی جو گاہ بگاہ بڑے بڑے عاقلوں کو بھی پیش آجاتی ہے اور سوائے خداوند علیم وخبیر اور کوئی اس سے منزہ نہیں۔ کسی مخالف مرضی کام کو موافق مرضی اور موافق مرضی کو مخالف مرضی سمجھ جائیں، اور اس وجہ سے بظاہر خلاف مرضی کام ہو جائے، تو ہو جائے۔ یا بوجہِ عظمت ومحبت مطاع ہی مخالفت کی نوبت آجائے؛ مگر اس کو گناہ نہیں کہتے، گناہ کے لیے یہ ضرور ہے کہ عمداً مخالفت کی جائے، بھول چوک کو لغزش کہتے ہیں، گناہ نہیں کہتے۔

یہی وجہ ہے کہ موقع عذر میں یہ کہا کرتے ہیں کہ: میں بھول گیا تھا، یا میں سمجھا نہ تھا۔ اگر بھول چوک بھی گناہ ہی ہوا کرتا، تو یہ عذر اور الٹا اقرار خطا ہوا کرتا، عذر نہ ہوا کرتا۔

اخلاق اور عقل وفہم:

جب یہ بات واضح ہوگئی کہ افعال تابع صفات ہیں، تو اب دو باتیں قابل لحاظ

باقی ہیں: ایک ''اخلاق'' یعنی صفات اصلیہ، دوسرے ''عقل وفہم''۔ اخلاق کی ضرورت تو یہیں سے ظاہر ہے کہ افعال جن کا کرنا نہ کرنا، عبادت اور اطاعت اور فرمانبرداری میں مطلوب ہوتا ہے، ان کا بھلا بُرا ہونا اخلاق کی بھلائی برائی پر موقوف ہے۔ اور اس سے صاف ظاہر ہے کہ اصل میں بھلی اور بری اخلاق وصفات ہی ہوتی ہیں۔ اور عقل وفہم کی ضرورت اس لیے ہے کہ اخلاق کے مرتبہ میں موقع بے موقع دریافت کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، تاکہ افعال میں بوجہ بے موقع جانے کے کوئی خرابی اوپر سے نہ آجائے۔

دیکھیے سخاوت اچھی چیز ہے؛ لیکن موقع میں صرف ہونا پھر بھی شرط ہے، اگر مساکین و مستحقین کو دیا جائے، تو فبہا؛ ورنہ رنڈیوں اور بھڑووں کا دینا، یا شراب خوروں اور بھنگ نوشوں کو عطا کرنا، کون نہیں جانتا کہ اور برائیوں کا سامان ہے۔ وجہ اس کی بجز اس کے اور کیا ہے کہ بے موقع صرف ہوا۔

بالجملہ افعال ہر چند تابع صفات ہیں؛ لیکن موقع بے موقع کا پہچاننا بجز عقل سلیم اور فہم مستقیم ہرگز متصور نہیں؛ اس لیے ضرور ہے کہ انبیاء میں عقل کامل اور اخلاق حمیدہ ہوں۔ ظاہر ہے کہ جب اخلاق حمیدہ ہوں گے، تو محبت بھی ضرور ہوگی؛ کیوں کہ خُلق حسن کی بنا محبت ہی پر ہے۔ اور جب موقع اور محل کا لحاظ ہے، اور عقل کامل موجود ہے، تو پھر خدا سے بڑھ کر اور کون سا موقع سزاوار محبت ہوگا؛ مگر خدا کے ساتھ محبت ہوگی، تو پھر عزم اطاعت وفرمانبرداری بھی ضرور ہوگا، جس کا انجام یہی نکلے گا کہ ارادۂ نافرمانی کی گنجائش ہی نہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اسی کو معصومیت کہتے ہیں۔

اخلاق حمیدہ اور عقل کامل مدارِ نبوت:

اب یہ گزارش ہے کہ مدار کار نبوت عقل کامل اور اخلاق حمیدہ پر ہے۔ رہے ''معجزات'' وہ خود نبوت پر موقوف ہیں، نبوت ان پر موقوف نہیں۔ یعنی یہ نہیں کہ جس

میں معجزات نظر آئیں، اس کو نبوت عطا کریں؛ ورنہ خیر؛ بلکہ جس میں نبوت ہوتی ہے، اس کو معجزات عنایت کرتے ہیں، تاکہ عوام کو بھی اس کی نبوت کا یقین ہو جائے اور نبی کے حق میں اس کے معجزے بمنزلۂ سند و دستاویز ہو جائیں؛ اس لیے اہل عقل کے نزدیک اول عقل کامل اور اخلاق حمیدہ ہی کا تجسس چاہیے؛ مگر عقل اور اخلاق میں دیکھا، تو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو سب میں افضل و اعلیٰ پایا۔ عقل و فہم میں اولیت و افضلیت کے لیے تو اس سے زیادہ اور کیا دلیل ہوگی کہ آپ ﷺ بذاتِ خود ''اُمّی'' اَن پڑھے، جس ملک میں پیدا ہوے اور جہاں ہوش سنبھالا؛ بلکہ ساری عمر گزری علوم سے یک لخت خالی، نہ علوم دینی کا پتہ اور نہ علوم دنیوی کا نشان، نہ کوئی کتاب آسمانی، نہ کوئی کتاب زمینی، بباعثِ جہل کیا کیا کچھ خرابیاں نہ تھیں، اب کوئی صاحب فرمائیں کہ ایسا شخص اُمی اَن پڑھا ایسے ملک میں اول سے آخر تک عمر گزارے، جہاں علوم کا نام ونشان نہ ہو، پھر اس پر ایسا دین اور ایسا آئین، ایسی کتاب لاجواب اور ایسی ہدایات بینات ایک عالم کو جس پر ملک عرب کے جاہلوں کو الٰہیات یعنی علوم ذات وصفات خداوندی میں، جو تمام علوم سے مشکل ہے اور علم عبادات اور علم اخلاق اور علم سیاسات اور علم معاملات اور علم معاش و معاد میں رشک ارسطو و افلاطون بنا دیا، جس کے باعث تہذیب عرب رشک شائستگی حکمائے عالم ہوگئی۔

آپ ﷺ اخلاق عظیمہ کے پیکر:

چناں چہ ان کے کمال علمی پر آج اہل اسلام کے کتب مطولہ، جو خارج از تعداد ہیں، شاہد ہیں۔ ایسے علوم کوئی بتلائے تو سہی، کس قوم اور کس فریق میں ہیں، جس کے فیض یافتہ اور تربیت یافتہ لوگوں کا یہ حال ہے، ان کے استاد اول اور معلم اول یعنی محمد رسول اللہ ﷺ کا کیا حال ہوگا۔ اور اخلاق کی یہ کیفیت کہ آپ کہیں کہ بادشاہ نہ

تھے، شاہزادے نہ تھے، امیر نہ تھے، امیرزادے نہ تھے، نہ تجارت کا سامان تھا، نہ کھیتی کا بڑا اسباب تھا، نہ میراث میں کوئی چیز ہاتھ آئی، نہ بذات خود کوئی دولت کمائی۔ ایسے افلاس میں ملک عرب کے گردن کشوں، جفا کشوں، برابر کے بھائیوں کو ایسا مسخر کرلیا کہ جہاں آپ کا پسینہ گرے، وہاں اپنا خون بہانے کو تیار ہوں۔ پھر یہ بھی نہیں کہ ایک دو روز کا ولولہ تھا، آیا نکل گیا، ساری عمر اسی کیفیت سے گزار دی، یہاں تک کہ گھر چھوڑا، باڑ چھوڑا، زن وفرزند چھوڑے، مال ودولت چھوڑا، آپ ﷺ کی محبت میں سب پر خاک ڈال، اپنوں سے آمادۂ جنگ و پیکار ہوئے، کسی کو آپ مارا، کسی کے ہاتھ سے آپ مارے گئے؛ یہ تسخیر اخلاق نہ تھی اور کیا تھی؟ یہ زور شمشیر کس تنخواہ سے آپ نے حاصل کیا؟ ایسے اخلاق کوئی بتلائے تو سہی۔ حضرت آدم میں تھے، یا حضرت ابراہیم میں تھے، یا حضرت موسیٰ میں تھے، یا حضرت عیسی (علیہم السلام) میں تھے؟

جب عقل واخلاق کی یہ کیفیت ہو، اس پر زہد کی یہ حالت، جو آیا وہی لٹایا، نہ کھایا نہ پہنا، نہ مکان بنایا، تو پھر کون سا عاقل یہ کہہ دے گا کہ حضرت موسی اور حضرت عیسی علیہم السلام وغیرہم تو نبی ہوں اور محمد رسول اللہ ﷺ نبی نہ ہوں، ان کی نبوت میں کسی کو تامل ہو کہ نہ ہو، پر محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت میں اہل عقل وانصاف کو تامل کی گنجائش نہیں؛ بلکہ بعد لحاظ کمالات علمی، جو آپ ﷺ کی ذات میں ہر خاص وعام کو ایسی طرح نظر آتے ہیں، جیسے آفتاب میں نور۔ یہ بات واجب التسلیم ہے کہ آپ ﷺ تمام انبیاء کے قافلہ سالار اور سب رسولوں کے سردار، اور سب میں افضل اور سب کے خاتم ہیں۔

آپ ﷺ صفات جمالیہ وکمالیہ کے مستجمع:

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ عالم میں جو کچھ ہے، انبیاء کے کمالات ہوں، یا اولیاء کے؛ سب عطائے خدا ہیں۔ چناں چہ مضامین مسطورہ بالا سے یہ بات عیاں

ہے؛ مگر عالم خصوصاً بنی آدم میں کمالاتِ مختلفہ موجود ہیں۔ کسی میں حسن و جمال ہے، تو کسی میں فضل و کمال ہے، کسی میں زور و قدرت ہے، تو کسی میں عقل و فراست ہے؛ اس لیے خدا کے اور بندوں کی اس وقت ایسی مثال ہوگی، جیسے فرض کیجیے کسی استاد جامع کمالات کے پاس مختلف فنون کے طالب آئیں اور ہر شخص جدے علم سے فیضیاب ہو کر اپنے اپنے کمالات دکھلائیں؛ مگر ظاہر ہے کہ اس کے شاگردوں کے آثار سے یہ بات خود نمایاں ہو جائے گی کہ یہ شخص کون سے فن میں استاد مذکور کا شاگرد ہے۔ اگر فیض منقول اس شاگرد سے جاری ہے، تو معلوم ہو جائے گا کہ فن منقول میں یہ شخص شاگرد استاد مذکور کا ہے۔ اور اگر فیض معقول جاری ہے، تو معلوم ہوگا کہ فن معقول میں استاد مذکور سے مستفید ہوا ہے۔ بیماروں کا علاج کرتا ہے، تو استفادۂ طب کا پتا لگے گا، اور شاعروں میں غزل خوانی کرتا ہے، تو تحصیل کمال شاعری کا سراغ نکلے گا۔ الحاصل شاگردوں کے احوال خود بتلا دیں گے کہ استاد کے کون سے کمال نے اس میں ظہور کیا ہے۔

ہر نبی کسی صفت جامعہ سے متصف ہوتا ہے:

الحاصل جب بنی آدم خصوصاً انبیاء میں مختلف قسم کے حالات موجود ہیں، اور پھر سب کے سب خدا ہی کے عطا اور فیض ہوں، تو بدلالت آثار و کاروبار انبیاء یہ بات معلوم ہو جائے گی کہ یہ نبی خدا تعالیٰ کی کون سی صفت سے مستفید ہے اور وہ نبی کون سی خدا کی صفت سے مستفیض ہے۔ یعنی گو ایک کے ساتھ اور سب صفتیں بھی قلیل و کثیر آئیں، پر اصل منبع فیض کوئی ایک ہی صفت ہوگی؛ مگر بدلالت معجزات انبیاء یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور صفت سے مستفید ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور صفت سے مستفید ہیں؛ کیوں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بدلالت احیائے موتیٰ و شفائے امراض مضمونِ جاں بخشی کا پتہ لگتا ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام میں بدلالت اعجوبہ

کاری عصائے موسوی کہ کبھی عصا تھا، کبھی اژدہا تھا، یہ معلوم ہوتا ہے کہ صفت تبدیل وتقلیب کا سراغ نکلتا ہے؛ مگر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ میں بدلالت اعجازِ قرآنی وکمالات علمی یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ صفت علم سے مستفید ہیں اور درگاہ علمی میں باریاب ہیں؛ مگر سب جانتے ہیں کہ علم وہ صفت ہے کہ تمام صفات اپنی کارگزاری میں اس کے محتاج ہیں، پر علم اپنے کام میں کسی صفت کا محتاج نہیں۔

کون نہیں جانتا کہ ارادۂ قدرت وغیرہ صفات بے علم وادراک کسی کام کے نہیں۔ روٹی کھانے کا ارادہ کرتے ہیں، اور پھر کھاتے ہیں، تو اول یہ سمجھ لیتے ہیں کہ روٹی ہے، پتھر نہیں۔ اور پانی پینے کا ارادہ کرتے ہیں، یا پیتے ہیں، تو یہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ پانی ہے، شراب نہیں، یہ علم نہیں تو اور کیا ہے؛ مگر روٹی کو روٹی سمجھنا اور پانی کو پانی سمجھنا ارادۂ قدرت پر موقوف نہیں۔ اگر روٹی سامنے آجائے، یا پانی سامنے سے گزر جائے، تو بے ارداہ واختیار وہ روٹی اور یہ پانی معلوم ہوگا۔

صفاتِ کمالیہ میں اول درجہ صفتِ علم کا:

القصہ علم کو اپنے معلومات کے تعلق میں کسی صفت کی ضرورت نہیں؛ مگر باقی تمام صفات کو اپنے تعلقات میں علم کی حاجت ہے۔ غرض جو صفات غیر سے متعلق ہوتے ہیں، ان سب میں علم اول ہے، اور سب پر افسر ہے اور علم سے اول کوئی صفت نہیں؛ بلکہ علم ہی پر مراتب صفات متعلقہ بالغیر ختم ہوجاتے ہیں؛ اس لیے وہ نبی جو صفت العلم سے مستفید ہو، اور بارگاہِ علمی تک باریاب ہو، تمام انبیاء سے مراتب میں زیادہ اور رتبہ میں اول اور سب کا سردار اور سب کا مخدوم کرم ہوگا اور سب اس کے تابع اور محتاج ہوں گے، اس پر مراتب کمالات ختم ہوجائیں گے؛ اس لیے وہ نبی خاتم الانبیاء بھی ضرور ہی ہوگا۔

افضلیت محمدی اور خاتمیت محمدی ﷺ:

وجہ اس کی یہ ہے کہ انبیاء بوجہ احکام رسانی مثل گورنر وغیرہ نواب خداوندی ہوتے ہیں؛ اس لیے ان کا حاکم ہونا ضرور ہے۔ چناں چہ ظاہر ہے؛ اس لیے جیسے عہدہائے ماتحت میں سب میں اوپر عہدۂ گورنری، یا وزارت ہے اور سوا اس کے اور سب عہدے ماتحت ہوتے ہیں۔ اوروں کے احکام کو وہ توڑ سکتا ہے، اس کے احکام کو اور کوئی نہیں توڑ سکتا۔ اور وجہ اس کی یہی ہوتی ہے کہ اس پر مراتب عہدہ جات ختم ہو جاتے ہیں۔ ایسے خاتم مراتب نبوت کے اوپر اور کوئی عہدہ یا مرتبہ ہوتا ہی نہیں، جو ہوتا ہے، اس کے ماتحت ہوتا ہے؛ اس لیے اس کے احکام اوروں کے احکام کے ناسخ ہوں گے، اوروں کے احکام اس کے احکام کے ناسخ نہ ہوں گے۔ اور اس لیے یہ ضرور ہے کہ وہ خاتم زمانی بھی ہو؛ کیوں کہ اوپر کے حاکم تک نوبت سب حکام ماتحت کے بعد میں آتی ہے اور اس لیے اس کا حکم اخیر حکم ہوتا ہے؛ چناں چہ ظاہر ہے۔ پارلیمنٹ تک مراقعہ کی نوبت سبھی کے بعد میں آتی ہے، یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ کسی اور نبی نے دعوئ خاتمیت نہ کیا، کیا تو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے کیا۔ چناں چہ قرآن وحدیث میں یہ مضمون بتصریح موجود ہے۔

سوا آپ ﷺ کے اور آپ سے پہلے اگر دعوئ خاتمیت کرتے، تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کرتے؛ مگر دعوئ خاتمیت تو درکنار، انھوں نے یہ فرمایا کہ: میرے بعد جہاں کا سردار آنے والا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی خاتمیت کا انکار کیا؛ بلکہ خاتم کے آنے کی بشارت دی؛ کیوں کہ سب کا سردار خاتم الحکام ہوا کرتا ہے اور درصورت مخالفت رائے اس کے احکام آخری احکام ہوا کرتے ہیں۔ چناں چہ مرافعہ کرنے والوں کو خود ہی معلوم ہے۔

معجزاتِ انبیاء آثارِ کمالات:

جب افضلیت محمدی اور خاتمیت محمدی (ﷺ) دونوں معلوم ہوگئیں، تو اب یہ گزارش ہے کہ: فقط افضلیت محمدی ﷺ کمالات ہی میں واجب التسلیم نہیں؛ بلکہ معجزات میں بھی افضلیت محمدی واجب الایمان ہے۔ اور کیوں نہ ہو، معجزات خود آثار کمالات ہوتے ہیں۔ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے مردے زندہ ہوے، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے عصائے بے جان اژدہائے جاندار بن گیا، تو کیا ہوا، رسول اللہ ﷺ کے طفیل سے کبھی کا سوکھا کھجور کی لکڑی کا ستون زندہ ہوگیا۔

ستونِ حنانہ اور عشق نبوی:

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ایک زمانہ تک رسول اللہ ﷺ جمعہ کے روز اپنی مسجد کے ایک ستون کے ساتھ جو کھجور کا تھا، پشت لگا کر خطبہ پڑھا کرتے تھے، جب ممبر بنایا گیا، تو آپ ﷺ اس ستون کو چھوڑ کر ممبر پر خطبہ پڑھنے تشریف لائے، اس ستون میں سے رونے کی آواز آئی، آپ ﷺ ممبر سے اتر کر اس ستون کے پاس تشریف لائے اور اپنے سینہ سے لگایا اور ہاتھ پھیرا، وہ ستون ایسی طرح چپکا ہوا، جیسے روتا ہوا بچہ سبکتا سبکتا چپکا ہو جاتا ہے۔

واقعۂ حنانہ ناقابلِ انکار:

اس واقعہ کو ہزاروں نے دیکھا، جمعہ کا دن تھا اور پھر وہ زمانہ تھا، جس میں نماز سے زیادہ اور کسی چیز کا اہتمام ہی نہ تھا، خاص کر جمعہ کی نماز، جس کے لیے اس قدر اہتمام شریعت میں کیا گیا ہے، کہ اس سے زیادہ اور کسی نماز کا اہتمام ہی نہیں۔ الغرض چھوٹے بڑے سب حاضر تھے۔ ایک دو اس وقت ہوتے، تو احتمال دروغ، یا وہم غلط فہمی بھی تھا۔ ایسے مجمع کثیر میں ایسا واقعہ عجیب پیش آیا، کہ نہ احیائے موتیٰ کو، جو اعجاز عیسوی تھا، اس سے کچھ نسبت اور نہ عصائے موسوی کے اژدہا بن جانے کو، جو معجزۂ

موسوی تھا، اس سے کچھ مناسبت۔

معجزاتِ انبیاء کا تقابلی جائزہ:

شرح اس معمہ کی یہ ہے کہ تنِ بے جان اور جسم مردہ کو قبل موت نہ تو کبھی روح سے تعلق تھا، نہ حیاتِ معروف سے مطلب۔ علاوہ بریں جسم انسان وحیوان گو منبع حیات نہ ہو؛ مگر قابل اور جاذب حیات ہونے میں تو کچھ شک بھی نہیں۔ یہی وجہ ہوئی کہ روح علوی کو اس خاک دانِ سفلی میں آنا پڑا، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ایام حیات کی ملازمت طویلہ کے بعد روح کو بدن کے ساتھ انس ومحبت کا ہونا بھی ضرور ہے، جس سے ادھر کی نگرانی اور معاودت کی آسانی ثابت ہوتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ سب باتیں ستون مذکور میں مفقود ہیں۔

علی ہذا القیاس حضرت موسیٰ علیہ السلام کی برکت سے اگر عصا اژدہا بن گیا اور زندہ ہوکر ادھر ادھر دوڑا، تو اس کی حرکات وسکنات بعد انقلاب شکل وماہیت ظاہر ہوئی۔ اور ظاہر ہے کہ اس شکل اور اس ماہیت کو جو بعد انقلاب حاصل ہوئی، حیات سے ایک مناسبت قوی ہے۔ یعنی سانپوں اور اژدہاؤں کے افعال اور حرکات اور ان کے وہ پیچ وتاب اور وہ کاٹنا اور نگل جانا اسی ماہیت اور اسی شکل کے ساتھ مخصوص ہے، اور زندوں سے بھی وہ کام نہیں ہوسکتے، چہ جائے کہ نباتات یا جمادات سے۔ القصہ شکل مذکور اور ماہیت مشار الیہ میں روح کا آنا چنداں مستبعد اور بعید اور عجیب وغریب نہیں، جتنا سوکھے ستون میں جو بالیقین بالفعل من جملہ جمادات تھا، روح وحیات کا آجانا محل استعجاب ہے۔ علاوہ بریں عصائے موسوی سے وہی کام ظہور میں آیا، جو اور سانپوں اور اژدہاؤں سے ظہور میں آتا ہے، کوئی ایسا کام ظہور میں نہیں آیا، جو ذوی العقول اور بنی آدم سے ظہور میں آتے ہیں؛ چناں چہ ظاہر ہے۔

اور ستونِ خشک کا دردِ فراق محمدی ﷺ، یا موقوفی خطبہ سے، جو اس کے قریب پڑھا جایا کرتا تھا، رونا چلانا وہ بات ہے، جو سوائے ذوی العقول؛ بلکہ ان میں سے بھی

بجز افراد کاملہ اور کسی سے ظہور میں نہیں آسکتے۔

محبت جمالی کے لیے دید اور محبت کمالی کے لیے عقل وفہم ناگزیر:

شرح اس معمہ کی یہ ہے کہ جیسے محبت جمالی کے لیے اول آنکھ کی ضرورت ہے اور پھر قابلیت طبعیت کی حاجت، جس کے سبب میلان خاطر اور توجہ دلی متصور ہو، ایسے ہی محبت کمالی کے لیے اول عقل وفہم کی ضرورت ہے اور پھر قابلیت مذکورہ کی حاجت۔ اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں تنہا تنہا بھی اور بحیثیت مجموعی بھی بجز بنی آدم اور ان میں سے بھی بجز کاملین عقل وطبیعت متصور نہیں۔ پھر اس پر طرہ یہ ہے کہ کاملانِ مذکور سے بھی جب ہی متصور ہے کہ کمالات محبوب کے علم کی نوبت علم الیقین اور عین الیقین سے گزر جائے اور مرتبۂ حق الیقین حاصل ہو جائے؛ کیوں کہ قبل مرتبۂ مذکورہ محبت کا حاصل ہونا ایسا ہی دشوار؛ بلکہ غیر ممکن ہے۔ جیسے قبل ذائقۂ شیرینی وغیرہ نعمائے لذیذہ شیرینی کی رغبت غیر ممکن ہے۔ یہ کبھی نہ سنا ہوگا کہ چکھنے سے پہلے فقط دیکھنے ہی کے سبب کسی غذائے نفیس ولطیف کی طرف رغبت حاصل ہو جائے۔ خواہ اس وقت چکھنے کا اتفاق ہو، جس وقت وہ غذا سامنے آئے، یا اس سے پیشتر یہ اتفاق ہو چکا ہو، خواہ بدلالت شکل وصورت یہ بات معلوم ہو جائے کہ اس غذا میں وہ مزہ ہے، جو پیشتر نصیب ہو چکا، یا کسی کے بتلانے سے معلوم ہو جائے کہ اس غذا میں وہ مزہ ہے، جو پہلے اڑا چکے ہیں۔ بہر حال قبل ذائقہ چشی رغبت ومحبتِ اغذیہ تصور بے جا ہے۔ اور کیوں نہ ہو، وجہ محبت کوئی خوبی اور صفت ہی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نکمی چیزیں کسی کو مرغوب نہیں ہوتیں۔ اور اگر کسی کو یہ خیال ہو کہ جمالی محبت میں فقط عین الیقین کافی ہے، دیدارِ خوبرویاں، جو مرتبۂ عین الیقین ہے، محبت کے لیے کافی ہے، کسی اور مرتبہ کی ضرورت نہیں؛ چناں چہ ظاہر ہے۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ کبھی حصول حق الیقین کے لیے اس حاسہ کے سوا جو

سامانِ عین الیقین ہوتا ہے، کسی اور حاسہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ جیسے غذاؤں میں ہوتا ہے، کہ عین الیقین تو بذریعۂ چشم میسر آتا ہے اور حق الیقین بوسیلۂ زبان حاصل ہوتا ہے۔ اور کبھی حصول حق الیقین کے لیے حواس ظاہرہ میں سے سوائے اس حاسہ کے جو آلۂ عین الیقین ہوتا ہے اور کسی حاسہ کی ضرورت نہیں ہوتی؛ بلکہ دونوں مرتبے اسی ایک حاسہ سے متعلق ہوتے ہیں، یا کوئی حاسہ باطنی آلۂ حق الیقین ہوجاتا ہے۔ سو محبت جمالی میں یہی قصہ ہے کہ جو آلۂ عین الیقین ہے، وہی آلۂ حق الیقین ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ غذاؤں کی محبت بوجہ صورت نہیں ہوتی، بوجہ ذائقہ ہوتی ہے، اور جمال کی محبت بوجہ صورت ہی ہوتی ہے، کسی اور وجہ سے نہیں ہوتی؛ اس لیے جمال میں عین الیقین اور حق الیقین ایک ہی حاسہ سے متعلق ہوتے ہیں، اور غذاؤں وغیرہ میں مرتبۂ عین الیقین آنکھوں سے متعلق ہے، تو مرتبۂ حق الیقین زبان سے متعلق ہے؛ کیوں کہ عین الیقین اس کو کہتے ہیں کہ خبر نہ رہے، مشاہدہ ہوجائے، اگر نوبت مشاہدہ نہ آئے؛ بلکہ ہنوز خبر ہی خبر ہے، تو بشرط یقین وہ علم خبری علم الیقین سمجھا جائے گا۔ اور اگر مشاہدہ سے بڑھ کر یہ بھی نوبت آجائے کہ اس شئی کو استعمال میں لائے اور اس کے منافع سے منتفع ہو، پھر یہ علم مرتبۂ حق الیقین کو پہونچ جائے گا۔

الحاصل مرتبۂ حق الیقین کا مرتبۂ عین الیقین کے ساتھ ساتھ ہونا بعض بعض مواقع میں موجبِ اشتباہ ہوجاتا ہے، اور یہ گمان ہوتا ہے کہ مرتبۂ عین الیقین ہی میں محبت اور رغبت پیدا ہوجاتی ہے۔

معجزاتِ انبیاء کا تنقیحی جائزہ:

جب یہ بات ذہن نشیں ہوچکی، تو اب سنیے! کہ جب پیدائش محبت مرتبۂ حق الیقین سے متعلق ہوئی، تو بالضرور اس بات کا اقرار لازم ہوا کہ ستون مذکور کو رسول اللہ ﷺ کے کمالات کا علم درجۂ حق الیقین کو پہونچ گیا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ جیسے یقین

میں اس مرتبہ سے بڑھ کر اور کوئی مرتبہ نہیں۔ ایسے ہی کمالات روحانی کی نسبت اس مرتبہ کا حاصل ہونا ہر کسی کو میسر نہیں آتا؛ کیوں کہ ارواح اور کمالات روحانی ایسے مخفی ہیں کہ بجز ارباب بصیرت و مکاشفہ اور کسی کو اس کا حصول متصور نہیں؛ مگر ظاہر ہے کہ ارباب بصیرت واصحاب مکاشفہ ہونا ایسا کمال ہے، جس کے کمال ہونے میں بجز احمق اور کسی کو شک نہیں ہو سکتا۔

الغرض عصائے موسوی اگر اژدہا بن گیا اور اژدہا بن کر چلا دوڑا، تو یہ وہ کام ہے کہ جتنے سانپ ہیں، سبھی یہ کام کرتے ہیں، کچھ سانپوں کے مرتبہ سے بڑھ کر کوئی کام نہیں، اور ستون محمدی اگر فراق محمدی ﷺ میں رویا، تو اس کا رونا محبت کمالات محمدی (ﷺ) پر دلالت کرتا ہے، جو بجز مرتبۂ حق الیقین متصور نہیں، جو بہ نسبت کمالات روحانی بجز ارباب کمال، یعنی اصحاب بصیرت و مکاشفہ اور کسی کو میسر نہیں آسکتا۔ اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں معجزۂ موسوی کو معجزۂ احمدی ﷺ کے سامنے کچھ نسبت باقی نہیں رہتی۔

اور سنیے! اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاں پتھر سے پانی نکلتا تھا، تو محمد رسول اللہ ﷺ کی انگشتانِ مبارک سے پانی کے چشمے جاری ہوئے تھے۔ اور ظاہر ہے کہ زمین پر رکھے ہوئے پتھر سے پانی کے چشمے کا بہنا اتنا عجیب نہیں، جتنا گوشت و پوست سے پانی کا نکلنا عجیب ہے۔

کون نہیں جانتا کہ جتنی ندیاں اور نالے ہیں، سب پہاڑوں اور پتھروں اور زمین ہی سے نکلتے ہیں۔ پر کسی کے گوشت و پوست سے کسی نے ایک قطرہ بھی نکلتا نہیں دیکھا۔

علاوہ بریں ایک پیالی پانی پر دست مبارک رکھ دینے سے انگشتانِ مبارک سے پانی کا نکلنا صاف اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ دست مبارک منبع البرکات ہے اور یہ

سب جسم مبارک کے کرامات ہیں۔ اور سنگ موسوی سے زمین پر رکھ دینے کے بعد پانی کا نکلنا اگر دلالت کرتا ہے، تو اتنی ہی بات پر دلالت کرتا ہے، کہ خداوند عالم بڑا قادر ہے۔

اور سنیے! اگر باعجاز حضرت یوشع علیہ السلام آفتاب دیر تک ایک جا ٹھہرا رہا، یا کسی اور نبی کے لیے بعد غروب آفتاب لوٹ آیا، تو اس کا ماحصل بجز اس کے اور کیا ہوا، کہ بجائے حرکت، سکون عارض ہو گیا ہو، یا بجائے حرکت روزمرہ حرکت معکوس وقوع میں آئی۔ اور ظاہر ہے کہ یہ بات اتنی دشوار نہیں، جتنی یہ بات دشوار ہے کہ چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے؛ کیوں کہ پھٹ جانا تو ہر جسم کے حق میں خلاف طبیعت ہے اور سکون کسی جسم کے حق میں بحیثیت جسمی خلاف طبیعت نہیں؛ بلکہ حرکت ہی خلاف طبیعت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جیسے اجسام کے پھٹ جانے کے لیے اور اسباب کی حاجت ہوتی ہے، ایسے ہی حرکت کے لیے بھی اور اسباب کی ضرورت پڑتی ہے اور سکون کے لیے کسی اور سبب کی ضرورت نہیں ہوتی۔

معجزات کا اعتبار ناگزیر:

ان تمام وقائع اور مضامین کے استماع کے بعد شاید کسی کو یہ شبہ ہو، کہ موجودات مرقومہ بالا کا من جملہ معجزات محمدی صلی اللہ علیہ وسلم مذکور ہوے، کیا ثبوت ہے؟ اور ہم کو کاہے سے معلوم ہو کہ یہ معجزات ظہور میں آئے ہیں؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم کو کاہے سے معلوم ہو کہ اور انبیاء اور اوتاروں سے وہ معجزات اور کرشمے ظہور میں آئے ہیں، جو ان کے معتقد بیان کرتے ہیں۔ اگر توراۃ وانجیل کے بھروسہ ان معجزات اور کرشموں پر ایمان ہے، تو قرآن واحادیث محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے اعتماد پر معجزات محمدی پر ایمان لانا واجب ہے؛ کیوں کہ توراۃ وانجیل کی کسی کے پاس آج کوئی سند موجود نہیں، یہ بھی نہیں معلوم کہ کس زمانہ میں یہ کتابیں لکھی

گئیں اور کون کون اور کس قدر ان کتابوں کے راوی ہیں۔ اور قرآن وحدیث کی سند اور اسناد کا یہ حال ہے کہ یہاں سے لے کر رسول اللہ ﷺ تک راویوں کی تعداد معلوم، نسب اور سکونت معلوم، نام اور احوال معلوم۔ پھر تماشہ ہے کہ توریت اور انجیل تو معتبر ہو جائیں اور قرآن وحدیث کا اعتبار نہ ہو۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ستم اور کون سی ناانصافی ہوگی، اگر توریت وانجیل وغیرہ کتب مذاہب دیگر لائق اعتبار ہیں، تو قرآن وحدیث کا اعتبار سب سے پہلے لازم ہے۔

حضرت نانوتویؒ اور تحقیق ادیان:

اب یہ گزارش ہے کہ: ہمارا یہ دعویٰ نہیں کہ اور مذاہب اور دین بالکل ساختہ اور پرداختۂ بنی آدم ہیں، بطور جعل سازی ایک دین بنا کر خدا کے نام لگا دیا، نہیں! دو مذہبوں کو تو ہم یقیناً دینِ آسمانی سمجھتے ہیں: ایک ''دین یہود'' اور دوسرے ''دین نصاریٰ''۔ ہاں اتنی بات ہے کہ بوجہ تحریف بنی آدم کے رائے کی آمیزش بھی ان دونوں دینوں میں ہوگئی ہے۔

باقی رہا دین ہنود، اس کی نسبت اگرچہ ہم یقیناً نہیں کہہ سکتے کہ اصل سے یہ دین بھی آسمانی ہے؛ مگر یقیناً یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ یہ دین اصل سے جعلی ہے، خدا کی طرف سے نہیں آیا؛ کیوں کہ اول تو قرآن شریف میں یہ ارشاد ہے:

''وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ''[1]۔

جس کے یہ معنی ہیں کہ: ''کوئی امت، (یعنی گروہِ عظیم) ایسی نہیں، جس میں کوئی ڈرانے والا نہ گزرا ہو''۔

ہندوؤں کے اوتار کا نبی، یا ولی ہونے کا امکان:

پھر کیوں کر کہہ دیجیے کہ اس ولایت ہندوستان میں جو ایک طویل عریض ولایت

---

(۱) سورۃ الفاطر، آیت: ۱۹۔

ہے، کوئی ہادی نہ پہونچا ہو، کیا عجب ہے کہ جس کو ہندو صاحب اوتار کہتے ہیں اپنے زمانے کے نبی، یا ولی یعنی نائب نبی ہوں۔

دوسرے قرآن شریف میں یہ بھی ارشاد ہے:

"**مِنۡهُمۡ مَنۡ قَصَصۡنَا عَلَيۡكَ، وَمِنۡهُمۡ مَنۡ لَمۡ نَقۡصُصۡ عَلَيۡكَ**"[1].

جس کا حاصل یہ ہے کہ: "بعض انبیاء کا قصہ تو ہم نے تجھ سے بیان کر دیا ہے اور بعضوں کا قصہ ہم نے بیان نہیں کیا"۔

ایک شبہ:

سو کیا عجب ہے کہ انبیائے ہندوستان بھی انہیں نبیوں میں سے ہوں، جن کا تذکرہ آپ سے نہیں کیا گیا۔ رہی یہ بات کہ اگر ہندوؤں کے اوتار انبیاء، یا اولیاء ہوتے، تو دعویٰ خدا نہ کرتے۔ ادھر افعال ناشائستہ مثل زنا، چوری وغیرہ ان سے سرزد نہ ہوتے؛ حالاں کہ اوتاروں کے معتقد۔ یعنی ہندو ان دونوں باتوں کے معتقد ہیں، جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یہ دونوں باتیں بے شک ان سے سرزد ہوئیں ہیں۔

جواب شبہ:

سو اس شبہ کا جواب یہ ہوسکتا ہے کہ: جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف دعویٰ خدا نصاریٰ نے منسوب کر دیا ہے اور دلائل عقلی و نقلی اس کے مخالف ہیں۔ ایسے کیا عجب ہے کہ شری کرشن اور شری رام چندر کی طرف بھی یہ دعویٰ بدروغ منسوب کر دیا ہے۔ جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام بدلالت آیات قرآنی اور نیز بدلالت آیات انجیل اپنے بندے ہونے کے مقر اور معترف تھے اور پھر وہی کام مدت العمر میں کیا کیے، جو بندگی کو سزاوار ہیں، دعویٰ خدائی پر نہیں بھپتے۔ یعنی نماز روزہ ادا کیا کیے، زبان سے عجز و نیاز کرتے رہے، جب کہا: آپ کو ابن آدم کہا اور بندہ قرار دیا۔ پھر اس پر ان کے ذمہ

---

(۱) سورۃ الغافر، آیت: ۷۸۔

تہمتِ دعویٔ خدائی لگادی گئی۔ ایسے ہی کیا عجب ہے کہ شری کرشن اور شری رام چندر کی نسبت تہمتِ خدائی لگادی ہو۔

علی ہذا القیاس جیسے حضرت لوط اور حضرت داؤد علیہما السلام کی نسبت باوجود اعتقاد نبوت یہود و نصاریٰ تہمتِ شراب خوری اور زناکاری لگاتے ہیں اور ہم ان کو ان عیوب سے بَری سمجھتے ہیں۔ ایسے ہی کیا عجب ہے کہ شری کرشن اور شری رام چندر بھی عیوب مذکورہ سے مبرہ ہوں، اوروں نے ان کے ذمہ یہ تہمت زنا و سرقہ لگادی ہو۔

الحاصل ہمارا یہ دعویٰ نہیں کہ اور ادیان اور مذاہب اصل سے غلط ہیں، دین آسمانی نہیں؛ بلکہ ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ اس زمانہ میں سوائے اتباع دین محمدی ﷺ اور کسی طرح نجات متصور نہیں، اس زمانہ میں یہ دین سب کے حق میں واجب الاتباع ہے۔

باقی رہا یہ شبہ کہ اس صورت میں اور دین منسوخ ٹھہریں گے اور یہ وہم پیدا ہوگا کہ پہلے احکام میں خدا تعالیٰ سے کچھ غلطی ہوئی ہوگی، جس کے تدارک اور اصلاح کے لیے یہ حکم بدلا گیا؟

نسخ اور معنیٔ نسخ کی وضاحت:

اس کا جواب یہ ہے کہ ''نسخ'' ایک لفظ عربی ہے، اس لفظ کے معنی ہم سے پوچھنے چاہییں۔ ''نسخ'' فقط ''تبدیل احکام'' کو عربی زبان میں کہتے ہیں؛ مگر حکام دنیا چوں کہ اپنے احکام جبھی بدلتے ہیں، جب کہ پہلے حکم میں کچھ نقصان معلوم ہوتا ہے؛ اس لیے نسخ کے لفظ کو سن کر یہ شبہ پیدا ہوتا ہے؛ ورنہ نسخ محض تبدیل احکام کو کہتے ہیں۔ اور صورت تبدیل احکام خداوندی یہ ہوتی ہے کہ جیسے منضج و مسہل اپنے اپنے وقت میں مناسب ہوتے ہیں اور اس لیے بعد اختتام میعاد منضج بجائے نسخۂ منضج نسخۂ مسہل بدلا

جاتا ہے اور اس تبدیلی کو بوجہ غلطی نسخۂ منسخ کوئی نہیں سمجھتا۔ ایسے ہی دین موسوی اور دین عیسوی اپنے اپنے زمانے میں مناسب تھے اور اس زمانہ میں یہی مناسب ہے کہ اتباع دین محمدی کیا جائے؛ کیوں کہ اور دینوں کی میعادیں ختم ہوگئیں، اب اسی دین محمدی ﷺ کا وقت ہے۔ عذاب آخرت اور غضب خداوندی سے نجات اس وقت رسول اللہ ﷺ ہی کے اتباع میں منحصر ہے۔ جیسے اس زمانہ میں گورنر زمانۂ سابق ''لارڈ نارتھ بروک'' کے احکام کی تعمیل کافی نہیں؛ بلکہ گورنر زمانۂ حال ''لارڈ لٹن'' کے احکام کی تعمیل کی ضرورت ہے۔ ایسے ہی اس زمانہ میں اتباعِ ادیانِ سابقہ کافی نہیں؛ دینِ محمدی کا اتباع ضروری ہے۔

سزائے سرکاری سے نجات اور رستگاری جب ہی ممکن ہے، جب کہ زمانۂ حال کے گورنر کا اتباع کیا جائے۔ اگر کوئی نادان یوں کہے کہ: گورنر سابق بھی تو ملکہ کا ہی نائب تھا، تو اس عذر کو کوئی نہیں سنتا۔ ایسے ہی یہ عذر کہ حضرت عیسی علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی تو رسول خدا تھے، اس وقت قابل استماع نہیں؛ بلکہ جیسے اس وقت اگر گورنر سابق بھی موجود ہو، تو لارڈ لٹن ہی کا اتباع کرے، جو گورنر زمانۂ حال ہے۔ ایسے ہی اس زمانہ میں اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی موجود ہوتے، تو ان کو چار ناچار رسول عربی ﷺ ہی کا اتباع کرنا پڑتا۔ اور اگر کوئی شخص اپنے خیال کے مطابق بوجہ غلطی کوئی عیب ہمارے پیغمبرِ خدا ﷺ کے ذمہ لگائے بھی، تو ہم ہزار عیب ان بزرگوں میں نکال سکتے ہیں۔

حضرت نانوتویؒ کی تقریر کا خلاصہ:

یہی تقریر ہو رہی تھی جو پادری صاحب نے فرمایا کہ: گھنٹہ پورا ہوگیا۔ خیر مولوی صاحبؒ تو بیٹھے اور عیسائیوں کی طرف سے پادری محی الدین پشاوری اٹھے اور مولوی صاحب کی تقریر پر چار اعتراض کیے، جن کے دیکھنے کے بعد اہل فہم کو یقین ہو جاتا ہے کہ

جیسے ہنود کی طرف سے مولوی صاحب کی تقریر کے رد میں آخر جلسہ تک کوئی صدا نہ اٹھی، پادری صاحبوں نے بھی گویا مطالب ضروری کو اس تقریر کے تسلیم ہی کرلیا؛ کیوں کہ مطالب اصلی اور ضروری تو اس تقریر میں کل آٹھ باتیں تھیں:

(۱) خدا کا ثبوت، (۲) اس کی وحدانیت، (۳) اس کا واجب الاطاعت ہونا، (۴) نبوت کی ضرورت، (۵) نبوت کی علامات اور صفات، (۶) رسول اللہ ﷺ کی نبوت، (۷) ان کی خاتمیت، (۸) ان کے ظہور کے بعد ان ہی کے اتباع میں نجات کا منحصر ہو جانا۔

پادری محی الدین کے چار بے جا اعتراضات:

ان آٹھوں باتوں میں سے تو ایک بات پر بھی پادریوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ ہاں پادری محی الدین مذکور نے مضامین ملحقہ اور زائدہ پر البتہ اعتراض کر کے البتہ انجام کار خود نادم ہوئے اور پادری صاحبوں کو نادم کرایا۔ وہ چار اعتراض یہ ہیں:

پہلا اعتراض:

(۱) ایک تو انبیاء کی معصومیت پر یہ اعتراض کہ حضرت آدم علیہ السلام نے باوجود ممانعت خداوندی گیہوں کیوں کھالیا اور مخالفت خداوندی کی؟ اور ظاہر ہے کہ اس مخالفت ہی کو گناہ کہتے ہیں۔

علیٰ ہذا القیاس حضرت داؤد علیہ السلام کی نسبت زن اوریا کے ساتھ نعوذ باللہ! زنا کا الزام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی نسبت بت پرستی کی تہمت لگا کر یہ کہا کہ: ''زنا'' اور ''بت پرستی'' دونوں گناہ ہیں۔ ادھر یہ دونوں نبی ہیں۔ سو باوجود ایسے ایسے بڑے گناہوں کے صدور کے ان کو معصوم کہنا سراسر غلط ہے۔ اور پھر اس پر یہ کہا کہ: یہ قصے کلام اللہ میں مذکور ہیں۔

یہ اعتراض تو وہ ہے، جس کی مدافعت خود اثنائے تقریر میں مولوی صاحب

کر چکے تھے؛ مگر بایں ہمہ عوام کے دکھلانے کو پادری صاحب اپنا کام کر گزرے۔

دوسرا اعتراض:

(۲) دوسرے مضمون آیت: ''وَاِنْ مِّنْ اُمَّۃٍ؛ اِلَّا خَلَا فِیْھَا نَذِیْرٌ''، پر، جس کا ترجمہ یہ ہے کہ: ''کوئی امت یعنی گروہ اعظم ایسی نہیں، جس میں کوئی ڈرانے والا خدا کی طرف سے نہ گزرا ہو''، یہ اعتراض کیا کہ: تم نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ہر گروہ میں نبی کے آنے کی ضرورت ہے، رسول اللہ ﷺ سے پیشتر ملک عرب میں کون سا پیغمبر تھا؟

اور اس کے ساتھ پادری صاحب کو یہ اشارہ کرنا بھی منظور تھا کہ جب قبل بعثت محمدی ﷺ کوئی پیغمبر ملک عرب میں نہ نکلا، تو پھر چالیس برس کی عمر تک جو رسول اللہ ﷺ کی نبوت کا آغاز اور اول زمانہ تھا، رسول اللہ ﷺ کا اپنے افعال میں مخالف دینِ خداوندی ہونا لازم آئے گا، جس سے معصومیت انبیاء میں صاف رخنہ پڑ جائے گا۔

تیسرا اعتراض:

(۳) تیسرا یہ اعتراض کہ: معجزات محمدی ﷺ کا ثبوت آپ کو قرآن سے دینا تھا، قرآن سے آپ نے ثبوت نہیں دیا؟

چوتھا اعتراض:

(۴) چوتھا اعتراض رسول اللہ ﷺ کی افضلیت پر یہ تھا کہ مسلمانوں کے ہاں درود اس طرح پر ہے:

''اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ، کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی سَیِّدِنَا اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی آلِ سَیِّدِنَا اِبْرَاھِیْمَ، اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ''.

اس درود میں لفظ ''کَمَا صَلَّیْتَ'' جو تشبیہ پر دلالت کرتا ہے، خود اس جانب مشیر ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل ہوں؛ کیوں کہ تشبیہ میں مشبہ بہ، مشبہ سے افضل ہوا کرتا ہے۔

یہ چار اعتراض کر کے انہوں نے اور پادری نولس صاحب بھی نے یہ فرمایا کہ: اعتراض تو اور بھی تھے؛ مگر بوجہ طول تقریر یاد نہیں رہے۔

مگر ان اعتراضوں کے معائنہ سے ناظرین کو یہ بھی معلوم ہو گیا ہو گا کہ اگر بالفرض والتقدیر اگر پادری صاحب اپنے بیان میں سچے ہی ہوں۔ یعنی ان کے خیال میں اثنائے تقریر میں کچھ اور بھی اعتراض آئے ہوں؛ مگر بوجہ طول تقریر یاد نہ رہے ہوں، تو بھی چار اعتراض تو ان سب میں گلِ سرسبد اور ان سب کا انتخاب ہی ہوں گے، جو یاد رہے۔ پھر جب ان کا یہ حال ہے کہ پادری صاحب بیان ہی نہ کرتے، تو اچھا تھا، نہ بیان کرتے، نہ نادم ہونا پڑتا، تو اور اعتراض تو کس شمار میں ہیں۔

پہلے اعتراض کا جواب: گناہ اور لغزش میں فرق:

الغرض پادری صاحب تو بیٹھے، مولوی صاحبؒ کھڑے ہوئے: اول تو فرمایا کہ: آپ اب تک گناہ کے معنی ہی نہ سمجھے، گناہ فقط مخالفت امر و ارشاد و نہی و منع ہی کو نہیں کہتے ہیں؛ بلکہ یہ بھی ضرور ہے کہ وہ مخالفت عمداً ہو، بوجہ نسیان و غلطی نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ موقع عذر میں یہ کہا کرتے ہیں کہ: میں بھول گیا تھا، یا میں سمجھا نہ تھا۔ اگر باوجود نسیان و غلط فہمی بھی مخالفت کو گناہ کہیے، تو پھر موقع عذر میں یہ کہنا کہ: میں بھول گیا تھا، سراسر لغو ہوا کرے۔

بہر حال! یعنی سرکشی کے لیے یہ بھی ضرور ہے کہ مخالفت مذکورہ بوجہ نسیان و غلطی نہ ہو، عمداً ہو، اور عمداً بھی ہو، تو اس شخص کی محبت اور عظمت، جس کی مخالفت کرتا ہے، باعث مخالفت نہ ہوئی ہو۔ چناں چہ اثنائے تقریر میں ہم نے خود اس مضمون کی طرف

اشارہ کر کے یہ کہہ دیا تھا کہ کبھی بھولے چوکے، یا بتقاضائے محبت بھی انبیاء سے مخالفت ہو جاتی ہے؛ البتہ عمداً نہیں ہوتی۔

حضرت آدم علیہ السلام اور گندم خوری:

الحاصل گناہ وہ مخالفت ہے، جو عمداً ہو، اور باعث مخالفت اس کی محبت وعظمت نہ ہوئی ہو، جس کی مخالفت کرتا ہے۔ اور اگر بوجہ نسیان یا بتقاضائے محبت وعظمت مخالفت سرزد ہو جائے، تو پھر اس کو گناہ نہیں کہتے؛ بلکہ ''زلت'' کہتے ہیں، جس کا ترجمہ ''لغزش'' ہے؛ مگر اس صورت میں حضرت آدم علیہ السلام کے گیہوں کھا لینے کو موافق اصول اہل اسلام گناہ اور جرم قرار دینا غلط ہے؛ کیوں کہ اول تو حضرت آدم علیہ السلام نے یہ حرکت مخالفت امر خداوندی بھول کر کی تھی۔ چناں چہ قرآن شریف میں حضرت آدم علیہ السلام کی شان میں یہ وارد ہے:

''فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا''(١).

جس کا حاصل یہ ہے کہ: ''آدم (علیہ السلام) بھول گئے، ہم نے ان میں پختگی نہ پائی''۔

اور اگر حضرت آدم علیہ السلام سے عمداً ہی یہ مخالفت ظہور میں آئی، تو اس کا باعث کوئی ہوائے نفسانی نہیں ہوئی؛ بلکہ بتقاضائے محبت خداوندی ان سے یہ حرکت سرزد ہوئی۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ قرآن شریف میں اس قصہ کو اس طرح پر فرمایا ہے:

''مَا نَهَاكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هَذِهِ الشَّجَرَةِ؛ اِلَّا أَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ، أَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخَالِدِيْنَ، وَقَاسَمَهُمَا اِنِّي لَكُمَا مِنَ النَّاصِحِيْنَ، فَدَلَّهُمَا بِغُرُوْرٍ''(٢).

جس کا حاصل اوپر کی عبارت کے ملانے سے یہ نکلتا ہے کہ شیطان نے حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا سے یہ کہا کہ: اس پھل کے کھانے سے تم کو خدا نے فقط اس

---

(١) سورۂ طہ، آیت: ١١۵۔ (٢) سورۂ اعراف، آیت: ٢١/٢٠۔

لیے منع کیا ہے کہ اسے کھا کر کہیں فرشتے نہ بن جاؤ، کہیں ہمیشہ رہنے والوں میں سے تم بھی نہ ہو جاؤ، پھر بعد اس کے شیطان نے قسم کھا کر کہا کہ: میں تمہارے خیر خواہوں میں سے ہوں۔ سو اس طور پر فریب دے کر ان کو نکال باہر کیا اور اس بلندی سے نیچے گرا دیا۔

یہاں تک حاصلِ مطلب قرآنی تھا، اب ہماری سنیے! کہ جب وجہ مخالفت فرشتے ہو جانے اور خلود یعنی ہمیشگی کا شوق ہے؛ چناں چہ سیاق آیت سے ظاہر ہے، تو پھر حضرت آدم علیہ السلام کی طرف موافق اہل اسلام گناہ کا الزام عائد نہیں ہو سکتا؛ کیوں کہ فرشتے مقربانِ بارگاہِ الٰہی ہوتے ہیں۔ اور آرزوئے تقرب خداوندی اسی شخص کو ہو سکتی ہے، جو خدا کو عظیم الشان سمجھتا ہو، اور خدا سے محبت رکھتا ہو۔ سو اس مخالفت کو گناہ کہنا، جو بالیقین بتقاضائے محبت خداوندی اور بلحاظ عظمت خداوندی ظہور میں آئے، سراسر ناانصافی ہے۔

الحاصل حضرت آدم علیہ السلام کا گیہوں کھا لینا من جملہ گناہ نہیں؛ بلکہ از قسم زلت ولغزش ہے۔

انبیائے کرام علیہم السلام پر بے بنیاد الزامات:

اس کے بعد یہ فرمایا کہ: حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کی نسبت آپ کا یہ فرمانا کہ: ''حضرت داؤد علیہ السلام نے نعوذ باللہ! ''زنا'' کیا، یا حضرت سلیمان علیہ السلام نے نعوذ باللہ! بت پرستی کی، اور باتیں قرآن میں موجود ہیں''؛ بالکل غلط ہیں، قرآن شریف میں کہیں ان باتوں کا پتا نہیں۔ اگر تم کو قرآن یاد ہوتا، تو تم کرسٹان نہ ہوتے۔

دوسرے اعتراض کا جواب:

پھر اس کے بعد فرمایا کہ: آپ جو یہ ارشاد کرتے ہیں کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے

پہلے کون نبی تھا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ: میں نے یہ کب کہا تھا کہ ہر قرن اور ہر زمانے میں نبی کا ہونا ضروری ہے، اگر میں یہ کہتا، تو البتہ تمہارا یہ اعتراض بجا تھا۔ میں نے فقط اتنا کہا تھا کہ: ہر گروہ میں کوئی ڈرانے والا خدا کی طرف سے چاہیے۔ اور ظاہر ہے کہ اس مضمون پر آپ کا اعتراض وارد نہیں ہوسکتا۔ اس کے بعد اعتراض ثالث کے جواب میں یہ ارشاد فرمایا کہ:

تیسرے اعتراض کا جواب:

اول تو قرآن شریف میں مذکور ہونا کوئی شرط ثبوت نہیں، روایت صحیح چاہیے، سو بحمد اللہ! روایات احادیث اہل اسلام جن میں اکثر معجزات محمدی ﷺ منقول ہیں، ایسی صحیح ہیں کہ توریت وانجیل کی روایات اس کے ہم پلہ نہیں ہوسکتیں۔ علاوہ بریں معجزۂ انشقاقِ قمر اور پیشین گوئی خلافت وغیرہ قرآن میں، اور کاہے میں ہیں۔

تنگیٔ وقت مانع جواب رابع:

اتنے میں پادری نولس نے فرمایا کہ: دس منٹ ہو چکے؛ اس لیے مولوی صاحب بہ مجبوری بیٹھ گئے۔ پر غالبًا یہ ارشاد فرمایا کہ: تنگیٔ وقت سے مجبور ہوں؛ ورنہ جواب اعتراض رابع موجود ہے، اس کے ساتھ یہ بھی کہا کہ: ایک ایک اعتراض کرتے جایئے اور جواب لیتے جایئے، بہت سے اعتراض اکٹھے ہو جاتے ہیں،، تو بوجہ تنگیٔ وقت جواب میں دقت پڑتی ہے؛ کیوں کہ اعتراض میں تو کچھ دیر نہیں لگتی؛ البتہ جواب کے لیے زمانہ واسع چاہیے۔

پادری محی الدین کی طرحی بات:

پادری محی الدین نے کہا کہ: اب سے ایسا ہی ہوگا۔ خیر سننے والوں کے دل میں ارمان رہ گیا؛ مگر سر رشتۂ اختیار اپنے بجز خاموشی کچھ نہ بن پڑا؛ کیوں کہ پادری صاحبوں نے سوال وجواب کے لیے دس منٹ مقرر کر دیے تھے اور ہنود بھی انہیں کے ہمصفیر

ہو گئے تھے؛اس لیے مسلمانوں کی خواہش در بارۂ عدم تعین وقت کچھ کارگر نہ ہوئی۔

حاصل کلام یہ ہے کہ مولوی صاحب تو بیٹھے اور پادری محی الدین پھر کھڑے ہوے اور یہ فرمایا کہ: حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے زنا اور بت پرستی کا بیان گو قرآن میں نہیں، پر بائبل یعنی توراۃ وزبور میں یہ افسانے موجو ہیں اور قرآن شریف میں بائبل کی تصدیق موجود ہے۔

قرآن وحدیث میں غیر محرف توراۃ وانجیل کی تائید:

یہ کہہ کر وہ تو بیٹھے، اور مولوی صاحبؒ کھڑے ہوے اور یہ فرمایا کہ: قرآن شریف میں بے شک توراۃ وانجیل کی تصدیق موجود ہے؛ مگر اس توراۃ وانجیل کی تصدیق ہے، جو حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام پر نازل ہوئی تھی، اس توراۃ وانجیل مذکور کا نہیں، جو آپ صاحبوں کے ہاتھوں میں ہے۔ اس کا اعتبار نہیں؛ کیوں کہ اس میں تحریف یعنی تغیر وتبدل واقع ہو چکی ہے۔

توراۃ وانجیل میں تحریفات کا اثبات:

اس پر پادری محی الدین صاحب بہت جھلا کر اٹھے اور فرمایا کہ: اگر آپ تحریف ثابت کر دیں، تو ابھی فیصلہ ہے۔ مولوی صاحبؒ نے فرمایا کہ: ابھی سہی، یہ کہہ کر جناب امام فن مناظرۂ اہل کتاب یعنی مولوی ابو المنصور صاحبؒ کی طرف مخاطب ہو کر یہ فرمایا کہ: ہاں مولوی صاحب! انجیل کے اس درس کی نسبت جو آج صبح آپ نے ہم کو مع اس کے حاشیہ کے دکھلایا تھا، علمائے نصاریٰ کی رائے سے پادری صاحب کو مطلع فرما دیجیے۔ امام صاحبؒ نے کھڑے ہو کر فرمایا کہ: تحریفات تو بہت ہیں؛ مگر مشتے نمونہ از خروارے درس سات، باب پانچواں یوحنا کا نامہ دیکھیے، اس میں یہ مضمون ہے کہ:

"تین ہیں جو آسمان پر گواہی دیتے ہیں: باپ اور کلام اور روح

القدس اور یہ تینوں ایک ہیں‘‘۔

اور یہ فرمایا کہ: یہ کتاب مرزاپور میں باہتمام اکابرانِ پادریان بہت اہتمام سے سوسائٹی کی طرف سے عبرانی اور یونانی زبان سے اردو میں ترجمہ ہوکر ۱۸۷۰ء میں چھپی، تو درس مذکور کی نسبت حاشیہ پر ان پادریوں نے جو اس کے طبع کے مہتمم تھے، یہ عبارت چھاپ دی ہے کہ: ’’یہ الفاظ کسی قدیم نسخہ میں نہیں پائے جاتے‘‘۔

اس پر پادریوں نے انکار کیا اور کہا: ایسا نہیں ہوسکتا؛ اس لیے مولوی محمد قاسم صاحبؒ نے امامِ فنِ مناظرۂ اہل کتاب جناب مولوی ابوالمنصور صاحبؒ سے یہ عرض کیا کہ: آپ وہ کتاب ہی منگالیجیے؛ اس لیے حسب اشارۂ امام صاحب ان کا ایک خادم دوڑا اور خیمہ میں سے وہ کتاب اٹھا لایا۔ امام صاحب نے وہ مقام کھول کر دکھلا دیا۔ دیکھتے ہی پادریوں کے تو ہوش اڑ گئے۔ اور اہل جلسہ پر یہ بات آشکارا ہوگئی کہ مسلمان بازی جیتے ؛ مگر اس پر بھی پادری محی الدین صاحب نے حیا کو کام فرمایا اور شرم اتارنے کو یہ فرمایا کہ: یہ تحریف نہیں، کمی بیشی ہے۔ ہر چند جواب تو اس کا یہی تھا کہ کمی بیشی خود اقسام تحریف میں سے ہے؛ اس لیے کہ حاصل تحریف فقط تغیر وتصرف ہے، کسی طرح ہو؛ مگر حسب بیان مولوی صاحب موصوف مولوی صاحب کو پادری صاحب کی انصاف پرستی سے یہ کھٹکا ہوا کہ پادری صاحب اس باب میں لا ونعم کرتے کرتے وقت کو خراب کردیں گے؛ اس لیے یہ فرمایا کہ: یہ تحریف نہیں، کمی بیشی ہے، تب بھی ہمارا مطلب ہاتھ سے نہیں جاتا۔ اثبات تحریر سے اہل اسلام کو اس سے زیادہ اور کیا مقصود ہے کہ تورات وانجیل قابل اعتبار نہیں۔ سو درصورت تسلیم کمی بیشی یہ بات بدرجہ اولیٰ ثابت ہوجائے گی۔

پادری جان ٹامس ’’خودرا فضیحت‘‘ کے مصداق:

اس اثنا میں پادری جان ٹامس صاحب کرستان اٹھے اور دربارۂ نسخ کچھ فرمانا

چاہا؛ مگر کھڑے ہو کر ایک دو لفظ ہی کہنے پائے تھے، جورہ گئے اور لاچار ہو کر ان کو یہ کہنا پڑا کہ: ہاں مولوی صاحب! آپ کیا فرماتے تھے؟ مولوی قاسم صاحبؒ نے فرمایا: معقول آپ کو اصل بات تو معلوم ہی نہیں، اعتراض کرنے آپ کس بھروسے کھڑے ہوے تھے۔ اس پر اکثر اہل جلسہ، یہاں تک کہ پادری لوگ بھی ہنس پڑے؛ مگر جوں توں سنبھل سنبھلا کر پادری صاحب نے یہ فرمایا کہ: اہل اسلام کے نزدیک اخبار میں نسخ نہیں ہوتا، احکام میں ہوتا ہے اور آیات قرآنی بعضے تو منسوخ التلاوۃ بھی ہیں اور منسوخ الحکم بھی ہیں، اور بعضے منسوخ الحکم ہیں اور بعضے منسوخ التلاوۃ ہیں۔

اس قسم کی بات بیان کر کے حسب عادت بس کر کے بیٹھ گئے؛ مگر کسی کو یہ معلوم نہ ہوا کہ پادری صاحب نے کس بات پر اعتراض کیا۔ موافق مثل مشہور "**المعنی فی بطن الشاعر**" پادری صاحب کے سوا اور کسی کو ان کا مطلب نہ کھلا، اور میں جانتا ہوں کہ وہ بھی اتنا ہی سمجھے ہوں کہ کوئی مطلب کی بات میں نے نہیں کہی؛ مگر بہت کھینچ تان کیجیے، تو تقریر سابق سے پادری صاحب کے کلام کو اس سے زیادہ مناسبت نہیں نکلتی کہ آیات منسوخ التلاوۃ کا قرآن سے نکال دینا قرآن کی نسبت بھی کمی کے اقرار کا باعث ہے، شاید اس لیے اس کے جواب میں غالباً مولوی قاسم صاحبؒ نے یہ فرمایا کہ: جب ہم کو بالیقین یہ معلوم ہے کہ پہلے اتنا تھا اور اب اتنا ہے، پہلے یہ حکم تھا اور اب یہ حکم ہے، اور پھر جو کچھ ہوا، خدا کے حکم سے ہوا، ہمارا تصرف نہیں، تو پھر قرآن کو تورات وانجیل پر قیاس کرنا سخت ناانصافی ہے۔

پادری نولس اور اعترافِ تحریف:

اس کے بعد پادری نولس صاحب بولے کہ بے شک یہ فقرہ زائد ہے اور جو کچھ پادریان مرزاپور نے لکھا، صحیح و درست ہے؛ مگر یہ چھاپ دینا اور اس کے الحاق کا اقرار کر لینا الٹا ہماری دیانت کی دلیل اور ہماری راست بازی کی علامت ہے، کہ جو بات

غلط تھی، اس کو غلط کہتے ہیں، صحیح نہیں کہتے۔

اس پر مولوی منصور علی صاحبؒ نے یہ فرمایا کہ: ہم یہ کب کہتے ہیں کہ آپ جھوٹے ہیں، آپ سچے سہی، ہمارا مطلب یہ ہے کہ آپ کا دین جھوٹا ہے، سو اس کا جھوٹا ہونا آپ کے اقرار سے ثابت ہوگیا۔

ادھر اول تو مولوی محمد قاسم صاحبؒ نے فرمایا کہ: اگر یہ فقرہ الحاقی ہے، تو اس کو انجیل سے نکال ڈالیے اور عقیدۂ تثلیث سے توبہ کیجیے؛ مگر اس پر پادری جان ٹامس صاحب نے یہ کہا کہ: ہم کو اس مضمون کی تعلیم اور طریقہ سے ہوئی ہے۔

اور پھر پادری نولس صاحب کی طرف مخاطب ہوکر (مولوی صاحب نے) یہ فرمایا کہ: پادری صاحب! اگر ایک پیالے پانی میں ایک قطرہ پیشاب کا گر جائے، تو وہ قطرہ سارے پانی کو ناپاک بنادیتا ہے، وہ پانی باوجودیکہ کے قطرہ سے اضعاف مضاعف اور کہیں زیادہ ہے، اس قطرہ کو پاک نہیں بنادیتا۔

اس پر پادری صاحب کو شور کرنے کا ایک بہانہ ہاتھ آگیا، کھڑے ہوکر بہت تیزی سے یہ فرمایا کہ انجیل خدا کا کلام ہے، اس قابل نہیں کہ اس میں ناپاکی ملائی جائے، آپ ایسی بُری تشبیہ نہ دیجیے۔

ہر چند پادری صاحب کا یہ شور بے جا تھا؛ کیوں کہ مولوی صاحب نے انجیل کو تو پاک ہی پانی سے تشبیہ دی تھی، ناپاک سے نہ دی تھی، قطرۂ ناپاک قطرۂ پیشاب سے اگر تشبیہ دی تھی، تو الحاقیات کو دی تھی اور ظاہر ہے کہ اس میں کوئی بے ادبی نہیں؛ بلکہ الحاق کو بے ادبی کہیے، تو سراسر بجا ہے؛ مگر حسب بیان مولوی صاحب اس وقت مولوی صاحب نے تطبیق مثال میں گفتگو کرنی فضول سمجھی اور اس اندیشہ سے کہ مبادا اس میں وقت ختم ہوجائے، یہ کہا کہ پادری صاحب! آپ کہاں تک ایسی باتیں کریں گے، آپ ایک مثال میں گفتگو کریں گے، میں اور دس مثالیں بیان کردوں گا۔ یہ تو آپ

اس سے کہیے، جس کو اور مثال نہ آتی ہو، آپ یہ مثال نہ سنیے، دوسری مثال سنیے!

اگر کوئی شخص حسن میں لا ثانی ہو، جمال میں یوسفِ ثانی ہو؛ مگر اس کی ایک آنکھ کانی ہو، تو اس کا یہ عیب ساری خوبیوں کو خراب کر دے گا، باقی اعضا کا حسن، اور ان کی خوبی اس آنکھ کے عیب کو خوبی نہ بنا دے گا۔ ایسے ہی اگر کسی دستاویز، کسی وثیقہ میں ایک جگہ مخدوش ہو، تو باقی دستاویز اور وثیقہ کی درستی اس ایک مقام مخدوش کو درست اور صحیح نہ بنا دے گی۔ اس ایک جگہ کا مخدوش ہونا تمام دستاویز اور تمام وثیقہ کو مخدوش بنا دے گا۔ پھر تماشہ ہے کہ مقدمات دنیوی میں تو ایسی دستاویزیں قابل اعتبار نہ رہیں؛ حالاں کہ اہل عقل کے نزدیک متاع دنیا چنداں قابل اہتمام نہیں اور مقدمۂ دینی میں ایسی دستاویز مخدوش لائق اعتبار ہو جائے۔

منصفِ شہر کی حکمیت:

اور اتفاق سے حالت وعظ میں منصف شہر یعنی شاہ جہاں پور بھی آ گئے تھے اور مولوی صاحب کے سامنے ہی بیٹھے ہوے تھے، مولوی نے یہ کہہ کر منصف صاحب کی طرف اشارہ کر کے پادری نولس صاحب سے فرمایا کہ: اس مقدمہ میں ہمارے آپ کے حَکَم منصف صاحب ہی رہے، اوروں کے مقدمات اور جھگڑے بھی یہی فیصل کرتے ہیں، ہماری ڈگری بھی یہی کریں گے اور پھر منصف صاحب کی طرف مخاطب ہو کر یہ فرمایا کہ: کیوں منصف صاحب! آپ ہی فرمائیں: اگر کوئی دستاویز جعلی آپ کے ہاں آئے اور اس کا جعل کھل جائے، خود مدعی اقرار جعل کرے، یا اور کسی طریقہ سے اس کا جعلی ہونا ثابت ہو جائے، تو قانون سرکاری اس کے نسبت کیا ہے اور آپ اس مقدمہ میں کیا فیصلہ فرمائیں گے؟؛ مگر منصف صاحب نے بطور اعلان کچھ نہ فرمایا، تبسم کرتے رہے، ہاں بعض صاحبوں سے سنا کہ منصف نے یہ فرمایا کہ: دعویٰ ڈسمس، دستاویز مسترد، مدعی اور گواہوں کو چودہ چودہ برس کی قید۔

شاید یہ بات منصف صاحب نے اپنے پاس کے صاحبوں کو فرمائی ہو، اور اس وقت اوروں نے سنی ہو۔ اور بعض کا یہ مقولہ ہے کہ یہ بات موتی میاں صاحب، یا مولوی عبدالحی صاحب نے فرمائی؛ مگر راقم حروف نے دونوں صاحبوں سے نہیں سنی، پر جس کسی نے کہی، انصاف کی بات کہی۔ ہاں ایک بات اپنی سنی ہوئی ہے، وہ یہ ہے کہ جس شب کو چاندا پور میں شاہ جہاں پور آئے، اس کی صبح کو راقم حروف مولوی محمد علی صاحبؒ کی خدمت حاضر تھا اور واقعۂ چاندا پور کے متعلق باتیں ہو رہی تھیں، ایک صاحب قوم کے مسلمان مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوے، انداز ملاقات سے یہ معلوم ہوا کہ مولوی صاحب کے آشناؤں میں سے ہیں، اس ذکر میں ذکر انہوں نے یہ بھی کیا کہ منصف صاحب یہ فرماتے تھے کہ مولوی محمد قاسم صاحبؒ نبوت کے متعلق تقریر بیان کر رہے تھے، جو میں بھی ان کے وعظ میں پہونچ گیا، مجھ کو وہ تقریر نہایت پسند آئی، اس کے اس بعد انہوں نے پادری کو ایسا ذلیل کیا کہ غیرت ہو، تو منھ نہ دکھائے اور میں ان کو نہیں جانتا تھا اور وہ مجھ کو نہیں جانتے تھے، خدا جانے انہوں نے مجھ کو کاہے سے پہچان لیا، جو بار بار میری طرف مخاطب ہو کر یہ کہتے تھے کہ منصف صاحب! آپ ہمارے حَکَم رہے، آپ اوروں کے مقدمے فیصل کرتے ہیں، ہمارا مقدمہ بھی آپ ہی فیصل کر دیجیے۔

فَبُهِتَ الَّذِىْ كَفَرَ:

القصہ پادری صاحبوں کو مولوی منصور علی صاحبؒ اور مولوی محمد قاسم صاحبؒ کی باتوں کا جواب نہ آیا، اِدھر وقت بھی آ گیا تھا؛ اس لیے جلسہ برخاست ہوا؛ مگر ان دو بار کے بعد جن کا مذکور ہوا، پادری محی الدین نہ اٹھے، ایک بار کسی قدر آمادہ بھی ہوے، اور پادری ان کی طرف گھورنے لگے، اور ان کا گھورنا بجا تھا، انہیں کی بدولت پادریوں کو یہ ندامت اٹھانی پڑی؛ اس لیے بطور ظرافت مولوی منصور علی صاحبؒ نے اس وقت

پادریوں سے یہ کہا: دیکھنا، پھر ان کو مت کھڑا کرنا، نہیں تو پھر اسی طرح فضیحت کرائیں گے۔ رہے ہنود، ان میں سے کوئی صاحب اس جلسہ میں اول سے آخر تک بولا بھی نہیں۔ وقت غروب آفتاب جلسہ برخاست ہوا، اہل اسلام شاداں وفرحاں اپنی فرودگاہ پر آئے۔

پادری محی الدین کے چوتھے اعتراض کا جواب:

بعد مغرب مولوی محمد قاسم صاحب اور مولوی منصور علی صاحب رحمہما اللہ وغیرہ خیمہ میں بیٹھے ہوئے تھے، کسی نے مولوی محمد قاسم صاحبؒ سے یہ کہا کہ: بوجہ تنگیٔ وقت اس اعتراض کا جواب رہ گیا، جو پادری محی الدین نے بدستاویز درود شریف رسول اللہ ﷺ کی افضلیت پر کیا، اگر آپ اس کا جواب بیان کرتے، تو کیا بیان کرتے؟ مولوی صاحب نے کہا: پادری محی الدین کا یہ اعتراض رسول اللہ ﷺ کی افضلیت پر بوجہ تشبیہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جو درود شریف میں واقع ہے، وارد نہیں ہوسکتا؛ کیوں کہ مشبہ بہ کا افضل ہونا تشبیہاتِ مجازی میں ضرور ہے، تشبیہاتِ حقیقی میں ضرور نہیں؛ بلکہ تشبیہات حقیقی میں یہ ضرور ہے کہ مشبہ بہ اور مشبہ، وجہ شبہ میں دونوں برابر ہوں، کوئی کسی سے کم وزیادہ نہ ہو؛ ورنہ تشبیہ سراسر غلط ہوگی۔ اور ظاہر ہے کہ درود شریف میں تشبیہ حقیقی ہے، تشبیہ مجازی نہیں۔ ہاں اس وقت یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی افضلیت پھر بھی ثابت نہیں ہوسکتی؛ کیوں کہ اگر مشبہ بہ، مشبہ سے تشبیہ حقیقی میں افضل نہیں، تو موافق بیان ہذا دونوں کا مساوی ہونا لازم آئے گا، حضرت رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام دونوں ہم پلہ ہوجائیں گے، ایک دوسرے سے افضل نہ رہے گا۔

اس شبہ کا اول جواب تو یہ ہے کہ تشبیہ فی النسبت میں نسبت کا مساوی ہونا ضرور ہے، منسوب الیہ اور منسوب کا برابر ہونا ضرور نہیں۔ مثلاً: یوں کہہ سکتے ہیں کہ ایک کو دو

کے ساتھ وہی نسبت ہے، جو ایک کروڑ کو دو کروڑ کے ساتھ نسبت ہے، تو اس صورت میں نسبت فیما بین تو بحکم تشبیہ مساوی ہے، پر اس نسبت کا منسوب الیہ، اس نسبت کا منسوب الیہ کے ساتھ اور اس نسبت کا منسوب اس نسبت کے منسوب کے ساتھ کوئی نسبت نہیں رکھتا۔ یعنی ایک کو ایک کروڑ کے ساتھ اور دو کو دو کروڑ کے ساتھ کچھ نسبت نہیں۔

جیسی روح ویسا فرشتہ:

علی ہذا القیاس یوں کہہ سکتے ہیں: جیسی روح، ویسے فرشتے، یعنی اگر اچھی روح ہے، تو وقت موت اس کے لینے کے لیے رحمت کے فرشتے آتے ہیں، اور اگر بُری روح ہے، تو اس کو لینے کے لیے عذاب کے فرشتے آتے ہیں۔ ایسے ہی یوں بھی کہہ سکتے ہیں: جیسی روح، ویسا بدن، یعنی اگر روح انسانی ہے، تو بدن انسانی ہوتا ہے اور شکل انسانی ہوتی ہے، اور اگر روح خنزیری ہوتی ہے، تو جسم وشکل بھی خیزیری ہی ہوتی ہے؛ مگر سب جانتے ہیں کہ کجا ارواح بنی آدم، کجا فرشتے، کجا ارواح، کجا اجسام، یہ نہیں کہ ارواح بنی آدم اور فرشتے برابر ہوجائیں اور ارواح بنی آدم وغیرہ اور اجسام بنی آدم وغیرہ برابر ہوجائیں۔ باوجود صحت تشبیہ ان مواقع میں ان اشیا کا برابر نہ ہونا اسی بات پر مبنی ہے کہ تشبیہ فی النسبت ہے، نسبت کا برابر ہونا چاہیے، اطراف کا مساوی ہونا ضرور نہیں۔

علی ہذا القیاس یوں کہہ سکتے ہیں: جیسا آفتاب، ویسی دھوپ، جیسا چاند، ویسی چاندنی، جیسا تخم، ویسی ہی شاخ وبرگ، جیسا درخت، ویسا ہی پھل۔ سو اسی طرح درود شریف میں بھی خیال فرمالیجیے۔

نبوت کے دو سلسلے:

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جیسے درویشی اور طریقت کے سلسلے متعدد ہیں، ایسے ہی نبوت کے بھی سلسلے متعدد ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل

علیہ السلام اور حضر رسول اللہ ﷺ تو ایک سلسلہ میں ۔ یہ سلسلہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے چلا اور حضرت رسول اللہ ﷺ پر ختم ہوگیا اور حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کی اولاد، حضر موسیٰ علیہ السلام ایک سلسلہ میں ہیں، یہ سلسلہ حضرت یعقوب علیہ السلام سے چلا اور دور تک چلا گیا؛ مگر سلسلۂ اول میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بمنزلۂ تخم سمجھیے اور حضرت رسول اللہ ﷺ کو بمنزلۂ درخت کامل سمجھیے ،جس میں شاخ و برگ، پھول پھل سب موجود ہوں۔

علیٰ ہذا القیاس سلسلۂ ثانی میں حضرت یعقوب علیہ السلام کو بمنزلۂ تخم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بمنزلۂ درخت کامل خیال فرمائیے اور پھر فرمائیے کہ باوجود امکان صحت تشبیہ تساوی کیوں کر لازم آتی ہے اور حضرت رسول اللہ ﷺ کی افضلیت کس طرح ہاتھ سے جاتی ہے۔

افضلیت محمدی ﷺ کی مزید تنقیح:

دوسرا جواب یہ ہے کہ: اگر کوئی شخص ایک ماشہ کندن سونا لے کر ہزار من سونا خریدنا چاہے، اور ماشہ بھر کندن سونے کو دکھلائے ،اور یہ کہے کہ ایسا خریدنا منظور ہے، تو یہ تشبیہ تو صحیح ہوتی ہے؛ مگر اس کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ ماشہ بھر اور ہزار من برابر ہوگئے، جتنے ہزار من والے کو عزت اور ثروت حاصل ہے، اتنی ہی ماشہ بھر والے کو بھی ثروت اور عزت حاصل ہے؛ بلکہ یہ مطلب ہوتا ہے کہ اس قسم کا ہو، اس نوع کا ہو، غرض تشبیہ فی النوع مراد ہوتی ہے اور اس وجہ سے تساوی نوعی ضرور ہے؛ مگر تساوی نوعی کو یہ لازم نہیں کہ مراتب شخصی بھی برابر ہوجائیں، جو ہزار من والے کا افضل ہونا اور ماشہ بھر والے کا کمتر ہونا لازم نہ آئے۔ ایسے ہی درود شریف میں صلوات ابراہیمی کو نمونہ سمجھیے اور تشبیہ فی النوع مراد لیجیے۔ اور ہزار من والا ماشہ بھر والے سے افضل ہوتا

ہے۔ایسے ہی رسول اللہ ﷺ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے افضل سمجھیے۔

منشی پیارے لال اور شرائط مناظرہ میں ترمیم کی درخواست:

اسی اثنا میں منشی پیارے لال صاحب تشریف لے آئے اور مولوی محمد قاسم صاحبؒ سے یہ فرمانے لگے کہ: بعد مغرب پادری اسکاٹ صاحب وغیرہم بھی آپہونچے اور گفتگوئے متعلق شرائط سن کر یہ فرمانے لگے کہ درس کے لیے ایک گھنٹہ سے کم نہ ہونا چاہیے، اس باب میں مسلمانوں کی رائے ٹھیک ہے؛ کیوں کہ ایک گھنٹہ سے کم میں کوئی کیا بیان کرے گا؛ اس لیے پادرر صاحب وغیرہ نے مجھ کو بھیجا ہے کہ آپ جو درس کے لیے ایک گھنٹہ تجویز کرتے تھے، اب ہم بھی وہی تجویز کرتے ہیں۔ اس پر مولوی صاحبؒ نے فرمایا: اب ہم کو منظور نہیں، ہم نے تین گھنٹے تک مغز زنی کی، اور بہزار منت پادری صاحب سے عرض کیا کہ کم سے کم ایک گھنٹہ درس کے لیے رکھیے؛ مگر پادری صاحب نے ایک نہ سنی، اب پادری اسکاٹ صاحب نے کہا، تو ہم سے کہتے ہیں کہ اچھا ایک ہی گھنٹہ سہی۔ ہم پادری صاحب کے محکوم نہیں، پادری صاحب اس میلہ کے حاکم نہیں، کہ وہ جو چاہیں، سو ہو، اس کے بعد منشی صاحب سے مولوی صاحب نے یہ کہا کہ: ہم کو ایک گھنٹہ سے انکار نہیں، پر پادری صاحب کو ذرا شرمانا بھی چاہیے، مجھ کو ان کا شرمانا بھی منظور ہے، اول ان کو شرما کر پھر اجازت دی جائے گی۔ پھر مولوی صاحب نے منشی صاحب سے کہا کہ: اب شاید پادری صاحب یہ بھی درخواست کریں کہ پادری اسکاٹ صاحب بھی مناظرہ کرنے والوں میں داخل کیے جائیں اور وہ آج پانچ پانچ آدمی گفتگو کے لیے مقرر ہوے تھے، اور ان کے نام معین ہو گئے تھے، وہ شرط بھی ترمیم کی جائے؟ منشی صاحب نے کہا: ہاں! وہ اس بات کے بھی خواستگار ہیں اور اس کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر اہل اسلام چاہیں، تو وہ بھی کسی اور کو شامل کر لیں۔ ہر چند یہ بات عین مطابق رائے مولوی صاحب کے تھی؛ کیوں کہ مولوی محمد علی صاحبؒ

بھی بعد مغرب ہی تشریف لائے تھے اور بوجہ کمال علمی مولوی صاحب موصوف مولوی محمد قاسم صاحب اور تمام مناظرین اہل اسلام کو یہ آرزو تھی کہ ان کا نام بھی مناظرین میں داخل کیا جائے؛ بلکہ بلحاظ تشریف منشی اندرمن ان کا مناظرین میں داخل ہونا ضرور تھا؛ بلکہ خاص اس لیے ان کو تکلیف دی گئی تھی؛ مگر تاہم بغرض مکافات درشتی پادری صاحب والزام حجت اس وقت بظاہر مولوی صاحب نے یہی فرمایا کہ بعد تقرر شرائط تغیر وتبدل ممکن نہیں، جو ہو چکا، سو ہو چکا۔

اور پھر فرمایا کہ منشی صاحب! مجھ کو کسی بات پر خواہ مخواہ آڑ نہیں؛ مگر ہاں پادری صاحب کی اس کج رائے پر کہ ہم منتیں کریں اور وہ تسلیم نہ کریں، بالفعل ہماری طرف سے یہی جواب ہے کہ اب کچھ نہیں ہوسکتا، آپ ان کو سنا دیں، باقی جو کچھ ہوگا، وقت پر دیکھا جائے گا، پھر منشی صاحب کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ: منشی صاحب! آپ نے دیکھا! پادری صاحب نے کیسے کیسے حیلے بہانے کیے اور کس کس طرح اہل اسلام کو اظہار مطالب اور اثبات مدعی سے مجبور کرتے ہیں، کہیں کہتے ہیں: دو روز سے زیادہ مباحثہ نہ ہو، کبھی فرماتے ہیں: چار منٹ، حد نہایت بیس منٹ سے زیادہ درس کے لیے وقت نہ دیا جائے، کوئی پادری صاحب سے پوچھے کہ پہلے کون اپنے مطالب کو ناپ تول کر لاتا ہے، جو وقت قلیل، محدود الطرفین میں بیان کرے اور مذہبی مباحث چار پانچ منٹ، یا دس بیس منٹ میں کوئی کیوں کر پورا کر سکتا ہے؛ بلکہ مولوی صاحب نے بعض مواقع میں یہ بھی فرمایا تھا کہ جس کے مذہب میں ایک دو فضیلت ہو، وہ دو چار منٹ میں بیان کر سکتا ہے، پر جس کے مذہب میں ہزاروں فضائل ہوں، وہ اتنے تھوڑے عرصے میں کس طرح بیان کر سکتا ہے۔

منشی پیارے لال اور اعترافِ حقیقت:

منشی صاحب نے مولوی صاحب کے اس فرمانے پر فرمایا کہ: واقعی اتنا ہم کو بھی

معلوم ہوتا ہے کہ پادری صاحب آپ سے گھبراتے ہیں اوران میں آپ سے مقابلہ کی طاقت معلوم نہیں ہوتی۔ پھر مولوی صاحب نے فرمایا کہ: ہم کوآپ سے یہ بڑی شکایت ہے کہ ہم اور پادری صاحب دونوں آپ کے بلائے ہوے، دونوں آپ کے مہمان ہیں، آپ کو لازم تھا کہ دونوں کو برابر سمجھتے؛ مگر جب آپ ڈھلتے ہیں، انہیں کی طرف ڈھلتے ہیں، جب تائید کرتے ہیں، تو انہیں کی کرتے ہیں، انہیں کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔ منشی صاحب نے فرمایا: ہم تو سبھی کے خادم ہیں، پر اتنا فرق ہے کہ پادری صاحبوں سے ناخوشی کا اندیشہ ہے، ڈرتا ہوں کہیں ناخوش ہوکر چلے نہ جائیں اور آپ کے اخلاق سے اس بات کا اندیشہ نہیں۔ علاوہ بریں آپ تو سب کی بات مان لیتے ہیں اور پادری صاحب کسی کی نہیں مانتے۔

پنڈت دیانند سرسوتی اور نانوتویؒ کے فضل وکمال کا اعتراف:

خیر منشی صاحب تو چلے گئے اور مولوی محمد قاسم صاحبؒ اسی پس وپیش میں مولوی محمد علی صاحبؒ کی خدمت میں موتی میاں صاحب کے خیمہ میں تشریف لے گئے، باتوں باتوں میں موتی میاں صاحب مولوی محمد قاسم صاحب سے فرمانے لگے کہ: پنڈت دیانند سرسوتی اور منشی اندرمن آپ کی اور مولوی منصور علی صاحب کی بہت تعریف کرتے تھے اور آپ دونوں صاحبوں کی تقریر اور علم کے بہت مداح تھے۔ بعد اس کے موتی میاں صاحب نے مہمان نوازی کو کام فرمایا، خاطر وتواضع سے سب کو مکلّف کھانا کھلایا۔

موتی میاں صاحب کی ظرافت طبع:

نماز عشاء سے فارغ ہوکر ہر ایک کو سونے کی سوجھی؛ مگر علاوہ ساکنانِ شاہ جہاں پور ونواحِ شاہ جہاں پور، دیوبند، میرٹھ، دلی، خورجہ، سنبھل، مرادآباد، رامپور، بریلی، تلہر تک کے بعض بعض شائقین تشریف لائے تھے، اور سب مل کر ایک مجمع کثیر ہوگیا

تھا؛اس لیے وہ خیمہ جوموتی میاں صاحب نے خاص باہر کے مہمانوں کے لیے حسب استدعائے مولوی محمد قاسم صاحبؒ نصب کرادیا تھا، کافی نظر نہ آیا۔اور ادھر موسم سرما کی یہ کیفیت کہ شب کو کسی دن کم، کسی دن زیادہ سردی ہوا کرتی تھی، اس روز اتفاق سے زیادہ سردی تھی، پھر اس پر جنگل کی ہوا، اور دریا کے کنارے شب کا وقت، درختوں کی آڑ اور خیمہ کے سایہ کے سوا اور کوئی بچاؤ نہ تھا، سردی کو گیا سمجھ کر سامانِ سرمائی اکثر صاحب ساتھ نہ لائے تھے۔ مولوی محمد قاسم صاحب کو اوروں کا فکر ہوا، موتی میاں صاحب کی خدمت میں جا کر یہ سب ماجرا بیان کیا اور کہا کہ مہمان بکثرت ہیں، وہ خیمہ جو آپ نے مہمانوں کے لیے کھڑا کیا تھا، کافی نہ ہوا، اب بجز اس کے چارہ نہیں کہ اجازت دیں، جن صاحبوں کو جائے نہ ملے، وہ آپ کے خیمہ میں آرام کریں؛ مگر موتی میاں صاحب کے اخلاق کریمانہ اور مہمان نوازی کی کیا تعریف کیجیے کہ سنتے ہی بکمال اخلاق یہ فرمایا: مولوی صاحب! یہ بات آج آپ کے پوچھنے کی نہیں، آج تو میں آپ سے پوچھوں، تو بجا ہے کہ میں کہاں سوؤں؟ ؛ مگر اتنی مہلت دیجیے کہ جو صاحب باقی ہیں، وہ کھانا کھالیں۔ القصہ کچھ یہاں، کچھ وہاں، جہاں کسی کو جگہ ملی، سر رکھ کر پڑ گیا۔صبح ہوتے ہی پھر وہی ذکر فکر تھا، جو اتنے میں ساڑھے سات بج گئے۔

کیفیت جلسۂ روزِ دوم

پادریوں کی طرف سے شرائط مناظرہ میں ترمیم پر بحث:

ساڑھے سات بجتے ہی گفتگو کرنے والے اور سننے والے سب میدانِ مناظرہ میں اکٹھے ہوے، اہل اسلام بھی بسم اللہ کر کے پہونچے۔ جب سب اپنے اپنے ٹھکانے پر بیٹھ گئے، تو اس وقت پادری نولس صاحب وغیرہ نے مولوی محمد قاسم صاحبؒ سے اس بات کی درخواست کی کہ وقت وعظ بڑھا دیا جائے اور آج ہماری طرف سے پادری اسکاٹ صاحب درس دیں گے۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ: کل ہم بہ ہزار منت آپ سے اس بات کی خواستگار رہے کہ کم سے کم درس کے لیے ایک گھنٹہ عنایت کیجیے، ہماری التماس اور عجز و نیاز پر تو آپ نے نظر نہ فرمائی، آج اگر کسی کے کہنے سننے سے اپنا نفع نظر آیا، تو آپ ہم سے اسی بات کے خواستگار ہوتے ہیں، جس کا ہم سے انکار کر چکے ہیں۔ جو ہو چکا، سو ہو چکا، اب کیا ہوتا ہے، نہ وقت مقرر میں تبدیلی ہو سکتی ہے، نہ پادری اسکاٹ صاحب کو درس کی اجازت ہو سکتی ہے۔ یہ بات وقت تجویز شرائط کے ساتھ گئی، اب کچھ نہیں ہو سکتا؛ ورنہ اس کے یہ معنی ہوے کہ ہم باوجودیکہ رکنِ مباحثہ ہیں، مباحثہ کے حساب سے کالعدم ہیں، جو کچھ ہوے، آپ ہی ہوے۔

اس پر پادری نولس صاحب نے فرمایا: آپ پادری اسکاٹ صاحب سے ڈرتے ہیں؟ مولوی صاحب نے فرمایا: میں تو خدا کی عنایت سے پادری اسکاٹ صاحب کے استاد ہوں، تو ان سے بھی نہ ڈروں؛ بلکہ ان شاء اللہ تعالیٰ! تمام پادری بھی اکٹھے ہو جائیں، تو نہیں ڈرتا، مجھ کو فقط یہ جتلانا تھا کہ بات کو مقرر کر کرا کر کون قائم رہتا ہے

اور کون پھر جاتا ہے؟ ہمارا تو یہ قول ہے کہ گھنٹہ، ڈیڑھ گھنٹہ جس قدر چاہیں آپ درس کے لیے مقرر کریں، جس کو چاہیں درس کے لیے تجویز کریں، ہم ہر طرح سے موجود ہیں۔ پر آپ کی طرف سے پادری اسکاٹ صاحب داخل مناظریں کیے جاتے ہیں، تو ہم جناب مولوی محمد علی صاحب کو شامل کریں گے؛ مگر ایسا یاد پڑتا ہے کہ گفتگو ہوا کر تینوں فریق کی رضا سے یہ بات مقرر ہوئی کہ آدھا گھنٹہ درس کے لیے رہے اور دس دس منٹ اعتراض و جواب کے لیے دیے جائیں۔

اول کون بیان کرے؟:

اسی اثنا میں یہ جھگڑا ابھی ہوتا رہا کہ اول کون کھڑا ہو، مولوی محمد قاسم صاحب نے چند بار فرمایا کہ اگر کوئی صاحب اول کھڑے ہونے سے گھبراتے ہیں، تو مجھ کو اجازت ہو، میں سب میں اول کھڑا ہوتا ہوں۔ جب یہ مرحلہ طے ہو چکا، تو پادری صاحبوں نے اور پلٹی کھائی، کیا فرماتے ہیں ان سوالات میں سے جو منشی پیارے لال کی طرف سے پیش ہوے، اول سوال چہارم میں گفتگو ہونی چاہیے۔ مولوی محمد قاسم صاحبؒ نے فرمایا: اگر لحاظ اثبات و تحقیق مذہب ہے، تو جیسا کل ہم عرض کرتے تھے، اول ذات باری میں گفتگو ہو، کہ ہے یا نہیں، اور ہے تو ایک ہے، یا متعدد؟ پھر صفات باری میں گفتگو ہو، کہ صفات مخصوصہ ذات خالق کیا کیا ہیں اور کون کون سے صفات اس میں پائے جاتے ہیں، کون سے نہیں پائے جاتے؟ پھر تجلیات جناب باری میں گفتگو ہو، یعنی جیسے آئینہ وغیرہ میں آفتاب وغیرہ کی جلوہ افروزی ہوتی ہے، خدا کی جلوہ افروزی کس کس چیز میں اور کہاں کہاں ممکن ہے؟ اس کے بعد نبوت میں گفتگو ہو، کہ انبیاء علیہم السلام کی ضرورت ہے کہ نہیں؟ اور کون ہے، کون نہیں، اس کے بعد احکام میں مباحثہ ہو، کہ کون سا حکم اصول مذکورہ پر منطبق ہو سکتا ہے اور کون سا حکم قابل تسلیم ہے، کون سا نہیں؟

اگر چہ بروئے انصاف بعد ثبوت نبوت شخص معین و صحت روایت عقل نارسا سے

احکام کی بھلائی برائی کی تفتیش امر لاطائل؛ بلکہ نازیبا ہے؛ کیوں کہ عقل سے یہ کام ہوسکتا، تو انبیاء علیہم السلام کی ضرورت ہی کیا تھی اور نبی کا کہنا واجب التسلیم ہوگا، تو پھر جو کچھ وہ فرمائیں، برسر وچشم۔ بہر حال! اگر اثبات وتحقیق مذہب پر نظر ہے، تو ترتیب عقلی یہ ہے، جو ہم نے کل عرض کی، اور اگر اثبات مذہب سے کچھ بحث نہیں، تو منشی پیارے لال صاحب ہی کے فرمانے کا اتباع ہے، تو جو ترتیب ان کی تجویز ہوئی ہے، اس کے موافق کام کیا جائے، بایں ہمہ ہم اس پر بھی راضی ہیں۔ اگر پنڈت صاحب وغیرہ مناظرانِ ہنود راضی ہو جائیں۔ غرض اہل اسلام کی طرف سے کسی امر میں یہ اصرار نہیں ہوا، کہ یوں ہو، یوں نہ ہو؛ مگر ہندوؤں اور عیسائیوں کی طرف سے دربارۂ سوالات اور تعیین اوقات البتہ اصرار رہا، ہندوؤں نے جو سوالات مذکورہ کی نسبت اصرار کیا، اور درس کے وقت کے بڑھانے پر راضی نہ ہوے، تو اس کی یہ وجہ تھی کہ حسب بیان بعضے معتبرین سوالات مذکورہ پنڈت دیانند کے تجویز کیے ہوے تھے، گو بظاہر سائل منشی پیارے لال تھے۔ چناں چہ سوالات خود کہے دیتے ہیں کہ کس نے تجویز کیے اور ظاہر ہے کہ جو شخص خود سوالات تجویز کرے گا، اور وہ بھی اس طور پر کے ایک ہفتہ پہلے سے اسی کام کے لیے آیا ہوا ہو، اس کو ان سوالات کے جواب میں کچھ دقت نہیں ہوتی، ہاں جو شخص پہلے سے بے خبر ہو، اس قسم کا سامان کتب اس کے ساتھ نہ ہو، اس کی دشواری دیکھنی چاہیے اور یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ ان کو افزائش وقت سے اول اول انکار رہا، یہ سمجھا ہوگا کہ ہم تو سمجھے سمجھائے ہوے ہیں، جو کچھ ہوگا، جھٹ پٹ بیان کردیں گے۔ پر جو شخص پہلے سے بے خبر ہو، وہ اگر کچھ بیان کرتا ہے، تو بدقت اور بدیر بیان کرتا۔ بایں ہمہ عجب نہیں پنڈت صاحب کو یہ بھی خیال ہو کہ پادری لوگ تو فلسفہ اور الٰہیات سے بے خبر ہوتے ہیں، رہے اہل اسلام، ان میں اگر چہ ان علوم کو ایسا جانتے ہیں، کہ عالم میں اب اور کوئی ایسا نہیں جانتا؛ مگر جو صاحب پادریوں کے مباحثہ

کے رکھتے ہیں، وہ صاحب اکثر ان علوم سے بے بہرہ ہوتے ہیں، وہی صاحب تشریف لائے ہوں گے۔ان سوالات کے جوابوں میں خواہ مخواہ رہ جائیں گے۔ہاں اور قسم کے سوالات پیش کیے گئے،تو پھر اہل اسلام سے بازی جیتنی البتہ امر محال ہے۔

شادم کہ از رقیباں دامن کشاں گزشتے:

علاوہ بریں جلسہ سال گزشتہ میں اہل اسلام کی تڑاق پڑاق کی گفتگو کے افسانے سنے ہوئے تھے؛ اس لیے یہ چال چلنی مناسب سمجھے اور پادری نولس صاحب وغیرہ جو سوالوں پر اڑے ہوئے تھے،تو اس کی دو وجہ معلوم ہوتی ہیں: ایک یہ کہ مولوی محمد قاسم صاحب نے جو روز اول دربارۂ تغیر سوالات بطور مشار الیہ بہت کچھ کہا سنا،تو وہ بھی مثل پنڈت صاحب شاید یہ سمجھے کہ ان سوالوں کے جواب میں یہ لوگ عاری ہیں، انہیں سوالات میں گفتگو ہو،تو بہتر ہے۔ہم کو جواب آئے کہ نہ آئے، پر کسی طرح سینہ سے سال گزشتہ کا داغ جائے، پار سال کا اہل اسلام کا غلبہ کسی طرح خاک میں مل جائے، گو ہم بھی لاجواب رہیں؛ مگر اس مجمع میں ہم کو کوئی کہے گا،تو بعد میں کہے گا، اول بدنام ہوں گے،تو اہل اسلام ہی ہوں گے۔

شادم کہ از رقیباں دامن کشاں گزشتے
گو مشتِ خاک ماہم برباد رفتہ باشد

دربارۂ ترمیمِ شرائط کشاکشی:

یہ نہ سمجھے کہ مولوی محمد قاسم صاحب کا التماس خدا جانے کس غرض سے ہے، دوسرے اس وقت تک ان کو یہ بھی بھروسہ تھا کہ پادری اسکاٹ صاحب علم معقول میں یکتا ہیں، رسالۂ منطق کی تصنیف پر سرکار سے پانچ سو روپیہ انعام پا چکے ہیں،شام تک وہ آجائیں گے، آج جوں توں دن کو ٹلاؤ؛ چناں چہ یہی ہوا، کہ روز اول اصرار اور انکار ہی میں وقت جلسہ گزر گیا اور گفتگو نہ ہونے پائی؛ مگر شام کو پادری اسکاٹ صاحب

تشریف لائے، تو سوالات کو سن کر گھبرائے؛ اس لیے اس بات کے مستدعی ہوئے کہ سوال چہارم میں اول گفتگو ہو، اور دربارۂ وقت درس اگر چہ پادری نولس صاحب نے غالباً بلحاظ وسعت تقریر مناظرانِ اہل اسلام جو سال گزشتہ میں دیکھ چکے تھے، بہت کچھ تنگی کرنی چاہی، چار منٹ سے بدشواری بیس منٹ پر آئے اور باوجودیکہ ان کو یہ یاد دلایا گیا کہ سال گزشتہ میں آپ باوجود اصرار اہل اسلام پندرہ منٹ سے زیادہ نہ بڑھے، اور پھر خود اپنے درس کے وقت آپ کو مولوی محمد قاسم صاحب سے پندرہ منٹ کے بعد اور پندرہ منٹ کی اجازت لینی پڑی، اس تجزیہ کے بعد بھی آپ وہی کہے جاتے ہیں۔ انہوں نے ایک نہ مانی؛ لیکن پادری اسکاٹ صاحب کو اپنے دن بھی نظر آئے؛ اس لیے باجود تقرر شرائط شرط وقت میں ترمیم کی تدبیر کے درپے ہوئے، کمی سے زیادتی کی طرف آئے؛ مگر اہل اسلام کی طرف سے روز اول تو دربارۂ شرائط کچھ تکرار ہوا، اور سوالات میں؛ اس لیے کہ مطلب اصلی یعنی تحقیق مذہب ہاتھ آئے۔ حاضرانِ جلسہ جو اکثر اسی امید میں آئے ہیں، محروم نہ جائیں۔ علاوہ بریں اس قسم کی باتیں چوں کہ اکثر کانوں میں پڑتی رہتی ہیں، ہر کوئی سمجھ سکتا ہے، جو باتیں کبھی سنی بھی نہیں، ان کو کون سمجھے گا۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس طور سے دوسروں کی نسبت اپنی درماندگی اور عجز کا ایہام منظور ہوتا کہ اس بنا پر حریف تو مغرور ہو جائے اور حاضرانِ جلسہ کو ان سے کچھ امید نہ رہی، پھر اس کے بعد حریف کو پچھاڑا، تو زیادہ لطف ہو گا اور سب کو یاد رہے گا؛ مگر آخر کار بایں خیال کہ مبادا حاضرانِ جلسہ کو گریز کا وہم ہو، اور پادری لوگ اور پنڈت لوگ یہ کہتے پھریں کہ اہل اسلام گریز کر گئے۔ مولوی محمد قاسم صاحب نے یہ فرمایا کہ:

ہم ہر طرح سے آمادہ ہیں، پنڈت صاحب کو راضی کر لیجیے؛ مگر پنڈت صاحب راضی نہ ہوئے، آخر کار منشی پیارے لال کی رائے پر منحصر رکھا گیا؛ مگر انہوں نے بھی اس

وقت پنڈت جی ہی کی سی کہی، یہ کہا کہ: میری رائے میں بھی یہی ہے کہ گفتگو ہو، تو حسب ترتیب سوالات ہو؛ اس لیے پادری صاحب کو مجبور ہونا پڑا، اور یہ کہا کہ میں کل بعد شام آیا تھا، عیسائی بھائیوں نے مجھ سے یہ کہا کہ کل تم کو سوال چہارم کا درس دینا پڑے گا۔ میں نے اسی سوال کو دیکھ بھال، سوچ سمجھ کر رکھا تھا؛ مگر جب آپ صاحب نہیں مانتے، تو بہ مجبوری میں اسی سوال کا درس دیتا ہوں، جو ان سوالات میں اول ہے۔

پادری اسکاٹ اور سوالاتِ خمسہ میں سے پہلے سوال کا جواب:

وہ سوال یہ تھا:

''خدا نے دنیا کو کب پیدا کیا، اور کاہے سے پیدا کیا، اور کیوں پیدا کیا''؟۔

غرض اس سوال کا جواب دینے کے لیے پادری اسکاٹ صاحب اس چوکی پر تشریف لے آئے، جو گفتگو کرنے والوں کے لیے بیچ میں بچھائی گئی تھی اور یہ فرمایا کہ: سائل جو پوچھتا ہے کہ خدا نے دنیا کو کاہے سے پیدا کیا؟

اس کا جواب تو یہ ہے کہ ''نیستی'' سے پیدا کیا، اپنی ''قدرت'' سے پیدا کیا، اپنے ارادے سے پیدا کیا۔

اور یہ پوچھتا ہے کہ کب پیدا کیا؟ یہ بات قابل سوال نہیں، اس سے بندہ کو کیا مطلب ہے کہ کب پیدا کیا، جو اس کی تحقیق کیجیے۔ غرض مباحثۂ مذہبی سے اس کو تعلق نہیں اور نہ کتب مذہبی کی رو سے اس کا ثبوت ہو سکتا ہے؛ البتہ مورخین اس میں کچھ لکھتے ہیں، سو ان کے اقوال خود مختلف ہیں؛ مگر اتنی بات یقینی ہے کہ عالم کے وجود کے لیے ایک ابتدا ہے۔

رہی یہ بات کہ کیوں پیدا کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی خوشی، جو اس کے جی میں آیا، اس نے کیا، عالم کے بنانے میں اس کا کچھ نفع نہیں، اگر ہو گا، تو کسی اور ہی کا نفع ہو گا۔

خلاصۂ جواب پادری صاحب اتنا ہی ہے، اگر چہ الفاظ اتنے کچھ تھے کہ ایک وقت وسیع پادری صاحب نے ان کے بیان میں صرف کیا۔ خیر پادری صاحب تو فارغ ہوکر کرسی پر بیٹھے اور مولوی محمد قاسم صاحبؒ کھڑے ہوے اور یہ فرمایا کہ:

حضرت نانوتویؒ اور پادری اسکاٹ کے جواب پر جرح:

پادری صاحب مطلب سوال ہی نہیں سمجھے، سائل کا یہ مطلب نہیں کہ موجود ہونے سے پہلے معدوم تھا، یا نہ تھا، خدا نے جو عالم کو پیدا کیا، تو اس کے بنانے میں قدرت سے یا کسی آلہ سے کام لیا۔ اگر یہ مطلب ہوتا، تو البتہ پادری صاحب کا یہ جواب مطابق سوال ہوتا، سائل کا یہ مطلب معلوم ہوتا ہے کہ مادۂ عالم کیا ہے؟ خداوند عالم نے عالم کو کس مادہ اور کس اصل سے بنایا؟

یہ کہہ کر منشی پیارے لال اور لالہ مکتا پرشاد وغیرہم کی طرف متوجہ ہوکر استفسارِ مطلب سوال کا ارادہ کیا ہی تھا، جو لالہ مکتا پرشاد نے کہا کہ: ہاں صاحب! یہی مطلب ہے جو آپ نے بیان کیا۔

اس کے بعد مولوی صاحب نے فرمایا کہ جب پادری صاحب مطلب سائل ہی نہیں سمجھے، تو ان کا جواب سراسر لغو ہوگیا۔ ”سوال از آسماں، جواب از ریسماں“ اسی کو کہتے ہیں۔ ہاں جوابِ سوال ہم بیان کرتے ہیں، حاضرانِ جلسہ متوجہ ہوکر سنیں!

جواب تحقیقی از حضرت نانوتویؒ:

عالَم کو خداوند عالم سے ایسی نسبت سمجھیے، جیسے دھوپ کو آفتاب سے نظر آتی ہے۔ جیسے آفتاب طلوع ہوتا ہے، تو اس کے نور سے عالم منور ہو جاتا ہے اور غروب ہو جاتا ہے، تو اس کا نور اس کے ساتھ چلا جاتا ہے، اور روئے زمین و آسمان تیرہ و تاریک رہ جاتے ہیں۔ ایسے ہی ارادۂ ایجادِ خداوندی سے مخلوقات موجود ہو جاتے ہیں، اس کے ارادۂ فنا سے مخلوقات فنا اور معدوم ہو جاتی ہے۔

جیسے دھوپوں کا مادہ وہ نور آفتاب ہے، جو اس سے لے کر دور تک پھیلا ہوا ہے اور تمام زمین و آسمان کو اپنے آغوش میں لیے ہوئے ہے۔ ایسے ہی تمام مخلوقات کی ہستی کا مادہ خدا کا وہ وجود ہے، جو تمام کائنات کو محیط ہے اور سب کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔

جیسے دھوپوں کی روشنی کی اصل آفتاب کا نور مذکور ہے، اور دھوپوں کے اشکال مختلفہ: مربع، مثلث، منحرف دائرہ وغیرہ موافق تقطیعات صحن و روشندان وغیرہ اس پر عارض ہو جاتے ہیں۔ ایسے ہی مخلوقات کی ہستی اور وجود کی اصل تو خدا کا وجود مذکور ہے۔ پر اشکال مختلفہ مخلوقات، جن کے وسیلے سے ایک کو دوسرے سے تمیز کر سکتے ہیں، موافق علم خداوندی اس پر عارض ہو جاتی ہیں۔

غرض جیسے کشتی اور کشتی میں بیٹھنے والوں کی حرکت تو ایک ہوتی ہے، پر کشتی اور کشتی میں بیٹھنے والے باہم مغائر ہوتے ہیں، کشتی اور ہے، کشتی نشیں اور، پھر میں اور ہوں، تم اور۔ ایسے ہی خداوند عالم اور عالم کا وجود تو ایک واحد ہے، پر خدا اور ہے، اور عالم اور ہے، میں اور ہوں، اور تم اور ہو۔

وجودِ عالم، وجود مطلق سے مستفاد:

غرض جیسے نور اور حرکت مذکور دونوں طرف منسوب ہے، آفتاب اور کشتی کی طرف انتساب صدور اور انتساب اولی اور ذاتی اور حقیقی ہے، اور زمین اور کشتی نشین کی طرف انتساب وقوع اور انتساب ثانوی اور عرضی اور مجازی ہے۔ ایسے ہی وجود واحد دونوں طرف منسوب ہے، خدا کی طرف تو نسبت صدور اور ذاتیت اور حقیقت اور اولیت ہے، اور عالم کی طرف نسبت وقوع اور عرضیت اور مجازیت اور ثانویت ہے۔

مخلوقات کی بھلائی برائی، خالق کی نہیں:

جیسے دھوپوں کی شکلیں مربع ہوں، یا مدوّر، مثل نور آفتاب کی طرف سے صادر

ہوکراوراس میں سے نکل کرنہیں آتیں، اوراس لیے مثل نوراس کی عطا اوراس کا فیض اوراس کی صفت نہیں؛ بلکہ یوں کہتے ہیں کہ آفتاب کے سبب پیدا ہوگئیں ہیں، آفتاب طلوع نہ ہوتا، تو یہ شکلیں پیدا نہ ہوتیں۔ ایسے ہی حقائق مخلوقات یعنی ان کی اشکال ممیّزہ خواہ ظاہرہ ہوں، جیسے حقائق اجسام، یا باطنہ، جیسے حقائق ارواح، مثل وجود خدا کی ذات سے صادر ہوکر اوراس سے نکل کرنہیں آئیں، جو ان کو فیض خداوند عالم اور عطائے خداوند عالم اور صفت خداوند عالم کہیے؛ بلکہ خداوند عالم کی ذات کے بدولت یہ تمام حقائق پیدا ہوگئے ہیں، اگر وہ ارادۂ ایجاد نہ کرتا، تو یہ کارخانہ پردۂ عدم سے جلوہ گاہِ وجود میں نہ آتا۔ اس صورت میں حقائق کی بھلائی برائی خالق کی بھلائی برائی کا باعث نہ ہوگی۔ وہ اشکال ہی بھلی بری کہلائیں گی۔

اس کی مثال ایسی ہے، جیسے صفحۂ کاغذ و دفتر پرکوئی خوش نویس بھلے اور برے حرف لکھ دے۔ ظاہر ہے کہ وہ حرف ہی بھلے برے معلوم ہوں گے، کاتب اور خوش نویس ان کے سبب بھلا برا معلوم نہ ہوگا۔ ایسے ہی حقائق ممکنہ کی بھلائی یا برائی، خدا کی بھلائی یا برائی کا باعث نہ ہوگی، وہ بھلائی اور برائی ان حقائق تک ہی رہے گی۔

بالجملہ حقائق ممکنہ خدا سے بھی مغائر اور باہم بھی مغائر؛ البتہ مادۂ حقائق مذکورہ وہ وجود مشترک ہے، جس کو خدا کی ذات سے وہ نسبت ہے، جو آفتاب کی شعاعوں کو اس کی ذات سے نسبت ہوتی ہے۔ مخلوقات اپنے وجود میں اس کی ایسی ہی محتاج ہیں، جیسی دھوپیں اپنے وجود میں شعاعوں کی محتاج ہیں، یا حرارتِ آبِ گرم اپنے وجود میں حرارتِ آتش کی محتاج ہے۔ چناں چہ مخلوقات کے وجود کی ناپائیداری اور آمد وشد ہی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ان کا وجود خانہ زاد نہیں، مستعار ہے، کسی ایسے کا فیض ہے، جس کا وجود اس کا خانہ زاد، اوراس کی ذات کے ساتھ مثل حرارتِ آتش ونور آفتاب لازم وملازم رہتا ہے۔

خدا نے دنیا کو کب پیدا کیا؟:

رہی یہ بات کہ خدا نے دنیا کو کب پیدا کیا؟ اس کے جواب میں ہم بھی پادری صاحب ہی کے ہمصفیر ہیں۔ واقعی یہ بات از روئے مذہب قابلِ استفسار نہیں، اگر قابل استفسار ہے، تو یہ بات ہے کہ کیوں بنایا؟ روٹی کی نسبت یہ بات پوچھنا کہ کب پکی اور کب پکائی؟ ایک امر لغو ہے، قابل استفسار ہے، تو یہ بات ہے کہ روٹی کا ہے کے لیے پکائی جاتی ہے؟

کیوں پیدا کیا؟:

سو غرض پیدائشِ عالم جو سوالِ اول کی تیسری شق ہے، البتہ قابل استفسار اور لائق جواب ہے؛ اس لیے ہم بھی عرض کرتے ہیں؛ مگر اول یہ عرض کرتے ہیں کہ: پادری صاحب کا بہ نسبتِ عرضِ پیدائش یہ کہنا کہ اس کی خوشی، یعنی خدا کی خوشی میں آیا عالم کو بنادیا، ایسی بات ہے کہ جس کو بعد تنقیح مطلب پادری صاحب کوئی عاقل تسلیم نہیں کرسکتا۔ اس کا حاصل تو یہ ہوا کہ عالم کے پیدا کرنے میں کوئی غرض اور حکمت نہیں، یوں ہی جو خوشی میں آیا، کرلیا۔ اگر یہ ہے تو یوں کہو: پادری صاحب نے خدا کے افعال کو بچوں کے افعال کے برابر کردیا، یہ شان بچوں کی ہوتی ہے کہ جو جی میں آیا، کرلیا، جی چاہا بیٹھ گئے، جی چاہا کھڑے ہوگئے، جی چاہا کودنے لگے، جی چاہا تھم گئے، کھانے کو جی چاہا کھالیا، سونے کو جی چاہا سو رہے۔ خدا کجا اور یہ بات کجا! اس کے افعال میں بھی حکمت نہ ہو، تو اور کس کے افعال میں حکمت اور مصلحت ہوگی۔ اس کے بندوں میں تو یہ صفت ہو کہ جو کریں، اس کے لیے کوئی نتیجہ سوچ لیں، کوئی حکمت اور مصلحت خیال میں بٹھالیں۔ خداوند عالم میں یہ عمدہ بات کیوں کر نہ ہوگی؛ مگر ہاں یہ مسلّم کہ مطالب مقصود دو طرح کے ہوتے ہیں: کبھی تو یوں ہوتا ہے کہ کرنے والا نتیجۂ افعال اور مقاصد اعمال کا محتاج ہو۔ جیسے بیمار، طبیب سے نسخہ لکھوا لینے جاتا ہے، تو اس

کواس کی حاجت ہوتی ہے،اور کبھی یوں ہوتا ہے کہ افعال کا کرنے والا ان کے نتیجہ کا محتاج نہ ہو؛ بلکہ کوئی دوسرا محتاج ہو،اوراس کی کاروائی مقصود ہو۔مثلاً: اگر طبیب نسخہ لکھتا ہے،تو بحیثیت طب طبیب کواس کی حاجت نہیں ہوتی؛ بلکہ دوسروں کی حاجت روائی مطلوب ہوتی ہے۔ایسے ہی خدوند عالم کوعالم کی پیدائش سے اس قسم کا مطلب تو ہرگز مرکوز خاطر نہیں،جس کی نسبت اس کا محتاج ہونا لازم آئے؛ کیوں کہ محتاج ہوگا،تو خدا ہی کیا ہوگا؛ بلکہ خدائی کو یہ لازم ہے کہ تمام موجودات اپنے وجود میں اس کے محتاج ہوں۔

عبادت اور عجز و نیاز مقصد تخلیق کیوں؟:

چناں چہ ہم کل ثابت کر چکے ہیں کہ اس کے افعال میں حکمت ہوگی،تو دوسری ہی قسم کی ہوگی۔چناں چہ عالم کو پیدا کرنے کے معنی بھی یہی ہیں کہ وجوداور لوازم وجود سے اس کوسرفراز فرمایا۔ہاں البتہ ان افعال میں،جن میں دوسری قسم کی حکمت ہو، خاص اپنی ذات کے لیے بجز اعزاز و تعظیم اور کچھ مقصود نہیں ہوتا،ہوتا ہے،تو یہی ہوتا ہے؛ بلکہ ضرور ہوتا ہے؛ اس لیے یہ داد ودہش وجود وصفاتِ وجود بھی جو خلاصۂ ایجاد ہے،کسی نہ کسی غرض کے لیے ہوگی۔وہ غرض کیا ہے؟ عبادت و بندگی اور عجز و نیاز ہے، جو اصل مطلوب خدا ہونا چاہیے۔یعنی اور جس صفت کو دیکھیے،خدا کی درگاہ میں اول موجود ہے،اور کوئی عالم ہے،تو وہ علیم ہے،کوئی قادر ہے،تو وہ قدیر ہے،اسی کے علم وقدرت کا پرتو ہے،جو مخلوقات میں علم وقدرت نمایاں ہیں۔یعنی جیسے آئینہ میں عکس آفتاب اور پرتوئے آفتاب نظر آتا ہے،درحقیقت آئینہ میں کوئی نور نہیں ہوتا۔ایسے ہی مخلوقات میں بھی عکس و پردۂ خداوندی ہے، درحقیقت ممکنات میں نہ علم ہے، نہ قدرت؛اس لیے اس قسم کی صفات تو مطلوب نہیں ہوسکتی؛ کیوں کہ یہ صفات تو خود اسی کے دیے ہوے ہیں،مطلوب وہ چیز ہوگی، جو اس کے پاس نہ ہوگی، ایسی چیز بجز عبادت و عجز و نیاز اور کیا ہوسکتی ہے۔یہی ایک ایسی چیز ہے،جو خدا کے پاس نہیں،خدا

کی درگاہ میں اس کا پتہ نہیں؛ مگر سارے عالم کا اس غرض سے مخلوق ہونا، اس طرح پر ہے کہ سارا عالم انسان کے لیے ہے اور انسان اس کام کے لیے ہے۔ اس وقت باقی عالم اور انسان کی ایسی مثال ہوگی، جیسے کہا کرتے ہیں: ''گھاس دانہ گھوڑے کے لیے اور گھوڑا سواری کے لیے''؛ مگر ظاہر ہے کہ اس وقت گھاس دانہ سے مطلب بھی وہی سواری ہوگی۔ علی ہذا القیاس روٹی کھانے کے لیے ہوتی ہے، اور لکڑی، اپلے روٹی کے لیے ہوتے ہیں؛ مگر سب جانتے ہیں کہ اس وقت لکڑیاں اور اُپلے بھی کھانے کے لیے مطلوب ہوں گے؛ اس لیے لکڑی، اپلے وغیرہ سب کے دام لگا کر کہا کرتے ہیں، کہ کھانے میں اتنا صرف ہوا۔

ہر شئ انسان کے کام کی، انسان کس کام کا؟:

الغرض جو چیز کسی چیز کا سامان ہو، وہ چیز اسی حساب میں اور اسی مد میں لکھی جاتی ہے اور اسی ذیل میں شمار کی جاتی ہیں؛ مگر زمین سے آسمان تک جس چیز پر نظر پڑتی ہے، انسان کے کار آمد نظر آتی ہے، پر انسان ان چیزوں میں سے کسی کے کام نہیں۔ اعتبار نہ ہو، دیکھ لیجیے!

''زمین'' اگر نہ ہوتی، تو کاہے پر تھمتے اور کاہے پر بیٹھتے، کاہے پر سوتے، کاہے پر چلتے پھرتے، کاہے پر کھیتی کرتے، کاہے پر مکان بناتے، کاہے پر باغ لگاتے۔ غرض زمین نہ ہوتی، تو انسان کو جینا محال تھا اور انسان نہ ہوتا، تو زمین کا کچھ نقصان نہ تھا۔

علی ہذا القیاس ''پانی'' نہ ہوتا، تو کیا پیتے اور نہ پیتے، تو کیوں کر جیتے، کاہے سے آٹا گوندھتے، کاہے سے سالن وغیرہ پکاتے، کاہے سے کپڑے وغیرہ دھوتے، کاہے سے نہاتے۔ غرض پانی نہ ہوتا، تو انسان کی زندگی دشوار تھی۔ اور انسان نہ ہوتا، تو پانی کا کیا نقصان تھا؟

''ہوا'' نہ ہوتی، تو سانس کیوں کر چلتا، کھیتی وغیرہ کا کام کیوں کر نکلتا، یہ ٹھنڈی

ہوائیں روح افزا کہاں سے آتیں۔ غرض ہوا نہ ہوتی، تو جان ہوا ہوجاتی۔ ہم نہ ہوتے، تو ہوا کو کیا دقت پیش آتی۔

اسی طرح اوپر تک چلے چلو، سورج، چاند، ستارے اگر نہ ہوتے، تو دیکھنا بھالنا، چلنا پھرنا ایک امر محال تھا۔ انسان نہ ہوتا، تو سورج کا نقصان تھا، نہ چاند وسورج کو کوئی دشواری تھی۔ آسمان اور اس کی گردشیں نہ ہوتیں، تو یہ سائبانی کون کرتا، اور یہ گرمی جاڑے کے موسم کیوں کر آتے۔ اور انسان نہ ہوتا، تو نہ آسمان کا نقصان تھا، نہ گردشوں میں کوئی دقت تھی۔

عبادت اور عجز و نیاز سے مقصود:

الغرض انسان کو دیکھیے، تو زمین وآسمان میں سے کسی کے کام کا نہیں، پر سوا اس کے جو چیز ہے، سب انسان کے کام کی ہے۔ اس صورت میں انسان اگر خدا کے کام کا بھی نہ ہو، تو یوں کہو کہ انسان سے زیادہ کوئی نکما ہی نہیں؛ مگر تم ہی فرماؤ کہ اس دانش وکمال اور اس حسن وجمال پر انسان کو کون نکما کہہ دے گا۔ اگر انسان اس افضلیت مسلمہ اور مشہورہ پر بھی نکما ہے، تو یوں کہو کہ اس سے زیادہ بُرا ہی کوئی نہیں؛ اس لیے چار ونا چار یہی کہنا پڑے گا کہ انسان خالق جہاں کے کام کا ہے۔ ایسی خوبی اور اس اسلوبی پر ایسے ہی بڑے کام کے لیے ہوگا؛ مگر ظاہر ہے کہ خداوند عالم کسی بات میں کسی کا محتاج نہیں، پھر انسان سے محتاج کا تو کیا محتاج ہوگا، جس کی سب سے زیادہ محتاجگی اسی سے ظاہر ہے کہ زمین سے لے کر آسمان تک تمام عالم کی اس کو ضرورت ہے؛ اس لیے یہی کہنا پڑے گا کہ اس کو بندگی اور عجز و نیاز کے لیے بنایا ہے؛ کیوں کہ یہی ایک ایسی چیز ہے، جو خدا کے خزانے میں نہیں؛ مگر چوں کہ یہ عجز و نیاز خدا کے مقابلہ میں موافق تقریر بالا ایسا ہوگا، جیسا طبیب کے سامنے بیمار کی منت وسماجت۔ تو جیسے بیمار کی منت وسماجت کا یہ ثمرہ ہوتا ہے، کہ طبیب اس کے حال زار پر مہربان ہوکر چارہ گری کرتا

ہے۔ایسے ہی انسان کی بندگی۔یعنی عجز و نیاز کی بدولت خداوند عالم اس پر مہربان ہو کر اس کی چارہ گری کیوں کر نہ کرے گا۔

خلاصہ:

بہر حال! تمام عالم انسان کے لیے ہے، اور انسان عبادت کے لیے ہے؛ اس لیے جیسے بایں وجہ کہ گھوڑا سواری کے لیے اور گھاس ودانہ گھوڑے کے لیے ہے، تو گھاس ودانہ بھی سواری ہی کے لیے سمجھتے ہیں۔ایسے ہی بایں وجہ کہ انسان عبادت کے لیے ہے اور تمام دنیا انسان کے لیے ہے، تمام عالم کو بھی عبادت ہی کے لیے سمجھیے۔ غرض مقصود اصلی پیدائشِ عالم سے عبادت ہے، جو سامان حاجت روائی بنی آدم ہے، اپنی حاجت روائی مقصود نہیں۔

جواب اِس کو کہتے ہیں!:

اس قسم کے مضامین مولوی صاحبؒ بیان کر رہے تھے، جو میعاد معینہ ختم ہوگئی؛ اس لیے مولوی صاحب تو بیٹھے اور پنڈت صاحب کھڑے ہوئے؛ مگر ہم نے سنا ہے کہ منشی پیارے لال، یا منشی مکتا پرشاد نے مولوی صاحب کے اس جواب کو سن کر یہ کہا کہ: ''جواب'' اس کو کہتے ہیں، یا یہ کہا کہ: جواب تو یہ ہوا؛ مگر جو کچھ کہا، بجا کہا۔ خیر مولوی صاحب تو بیٹھے اور پنڈت دیانند صاحب موقع گفتگو پر تشریف لائے اور اپنے محاورات میں کچھ فرمانا شروع کیا؛ مگر چوں کہ ان کی زبان میں الفاظ سنسکرت بہت ملے ہوئے تھے؛ بلکہ اکثر جملے کے جملے سوائے کہ کام وغیرہ حروفِ ربط کے سنسکرت میں ہوتے تھے، تو سوائے دو چار آدمیوں کے حاضران جلسہ میں ان کے مطلب کو کوئی نہ سمجھا ہوگا۔

پنڈت دیانند اور نظریۂ قدم عالم:

ہاں ایک دو بات اس قسم کی سمجھ میں آئیں کہ جیسے: ''کمہار گھڑا وغیرہ برتن بناتا

ہے،تو اول گارا ہونا ضرور ہے، گارا نہ ہو،تو پھر برتن نہیں بن سکتا۔ایسے خدا نے جو اس عالم کو بنایا،تو اس کا مادہ پہلے ہی سے ہونا چاہیے، وہ بھی مخلوق ہو،تو پھر عالم کا بنانا ایسا ہوگا، جیسا بے گارے برتن بنایئے۔غرض مادۂ عالم قدیم ہے اور پھر قدیم سے عالم کا وجود ہے اور ہمیشہ ایسا ہی چلا جائے گا اور جیسا کہ پادری صاحب کہتے ہیں کہ قدرت الٰہی سے نیست سے ہست ہوا، یہ بات معقول نہیں؛ کیوں کہ نیست کوئی چیز نہیں،اس سے کوئی چیز پیدا نہیں ہوسکتی‘‘؛مگر ان دو ایک بات کے سوا اور کچھ کسی کو سمجھ میں نہ آیا، یہ بھی نہ معلوم ہوا کہ غرض پیدائش عالم انہوں نے کچھ بیان کی یا نہ کی اور بیان کی،تو کیا بیان کی؟

ہاں اوروں کے بیان سے اتنا معلوم ہوا کہ پنڈت صاحب اس وقت تناسخ نقطہ، یعنی ’’آواگون‘‘ کے بھی مدعی ہوے۔خدا جانے اس دعوی کے لیے کیا دلیل پیش کی ہوگی۔الغرض اصل مطلب تو بوجہ دقت زبان معلوم نہ ہوتا تھا؛اس لیے مولوی محمد قاسم صاحبؒ نے عین اس وقت، جس وقت پنڈت صاحب تقریر کررہے تھے، اپنی کرسی سے اٹھ کر آہستہ سے منشی اندرمن صاحب سے یہ کہا کہ: آپ اگر خود کچھ بیان نہیں فرماتے،تو یوں ہی کیجیے کہ آدھے وقت میں تو پنڈت صاحب جو کچھ ان کو بیان کرنا ہو، کرلیا کریں،اور آدھے وقت میں آپ اس کا ترجمہ کردیا کریں، جو ہم بھی کچھ سمجھیں؛ ورنہ پھر نہ تسلیم کی کوئی صورت ہے، نہ اعتراض کی کوئی جگہ؛مگر منشی صاحب نے اس کے جواب میں یہ کہا: سچ تو یہ ہے کہ مجھ کو کبھی لکچر دینے کا اتفاق نہیں ہوا، جو لوگ یہ کام کرتے رہتے ہیں، انہیں سے ہوسکتا ہے؛ اس لیے میں معذور ہوں۔خیر چار ناچار پنڈت صاحب نے جو کچھ سنایا،سننا پڑا۔

جب وہ فارغ ہوے،تو حسب ترتیب اول پادری اسکاٹ صاحب پھر کھڑے ہوے؛مگر باوجودیکہ وقت اعتراض تھا،اپنی تقریر اول پیش کی۔جب پادری صاحب

اپنا کام کر چکے، اور اہل اسلام کی نوبت آئی، تو مولوی محمد قاسم صاحبؒ نے جناب مولوی محمد علی صاحب کی خدمت میں یہ عرض کیا کہ: یہ نیاز مند تو پنڈت صاحب کی تقریر کچھ سمجھا نہیں؛ اس لیے اب آپ ہی کو تکلیف کرنی پڑے گی، اگر میں کچھ سمجھتا ہوتا، تو ان شاء اللہ تعالیٰ تا مقدور آپ کو تکلیف نہ کرنے دیتا؛ مگر مولانا محمد علی صاحبؒ نے فرمایا کہ: میں بھی پورا پورا نہیں سمجھا؛ مگر مولوی محمد قاسم صاحب نے عرض کیا کہ: میں کچھ بھی نہیں سمجھا؛ اس لیے مولانا محمد علی صاحب اٹھے اور یہ فرمایا کہ:

پنڈت دیانند کے نظریہ کی تردید:

پنڈت صاحب کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ عالم ازلی ہے اور مادہ بھی قدیم ہے اور پیدا کیا ہوا کسی کا نہیں۔ لازم آیا کہ مادہ واجب الوجود ہے، پس دو واجب الوجود موجود ہوے اور توحید جاتی رہی۔ علاوہ ضرورت تسلیم باری تعالیٰ کی کیا رہی، سوا اس کے کہ یہ بات ظاہر ہے کہ عالم مرکب ہے اور ترکیب کے واسطے حدوث لازم ہے۔ اس صورت میں قدم عالم بالبداہت باطل ہے۔

مادۂ عالم قدیم ہے، عالم قدیم نہیں: پنڈت دیانند:

پھر پنڈت صاحب کھڑے ہوے اور حسب بیان اہل فہم اول تو انھوں نے پادری صاحب پر وہی اعتراض سابق کیا، بعد ازاں اپنے اوپر کے اعتراض کا جواب اس طور پر دیا کہ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

ہمارے بیان کو ہمارے مقابل فریقوں نے اچھی طرح نہیں سمجھا، ہم صرف مادۂ عالم کو قدیم کہتے ہیں، عالم کو قدیم نہیں کہتے ہیں۔ عالم کو اس مادہ سے خدا تعالیٰ نے ایجاد کیا ہے، اور چوں کہ ایجاد کرنے والا عالم کا خدا تعالیٰ ہے؛ اس لیے خدا کے ماننے کی ضرورت ہوئی؛ کیوں کہ مادہ سے خود بخود عالم پیدا نہیں ہو گیا؛ بلکہ پیدا کرنے والا عالم کا خدا تعالیٰ ہے۔

غرض خلاصۂ بیان پنڈت صاحب یہ تھا، اتنا ہی کہنے پائے تھے کہ دس منٹ پورے ہو گئے؛ اس لیے پنڈت صاحب تو چوکی سے اترے اور یہ یاد نہیں رہا کہ پھر کون کھڑا ہوا۔ ترتیب مشارالیہ تو یوں کہتی ہے کہ پادری صاحبوں میں سے کوئی کھڑا ہوا ہو؛ چناں چہ اتنا یاد ہے کہ سوائے پادری اسکاٹ صاحب دیسی پادریوں میں سے بھی بعض صاحب اٹھے تھے؛ مگر چوں کہ ان کی تقریر قابل التفات نہ تھی، تو کچھ یاد نہیں رہا، کہ انہوں نے کیا بیان کیا اور کیا نہ کیا؟

مادۂ عالم قدیم ماننے سے وحدانیت باطل: نانوتویؒ:

البتہ اتنا یاد ہے کہ اسی اثنا میں ایک بار مولوی محمد قاسم صاحبؒ پھر کھڑے ہوئے اور یہ فرمایا کہ پنڈت صاحب جس کو مادۂ قدیم کہتے ہیں، اگر وہی وجود مذکور ہے، جس کو ہم نے مادۂ عالم قرار دیا ہے، تو چشم ماروشن، دل ماشاد، پنڈت صاحب بھی ہمارے ہی ہمصفیر ہو گئے اور اگر کچھ اور چیز ہے، یعنی خدا کی صفت اور اس کی تجلی نہیں؛ بلکہ ایک امر مستقل اور خدا کی ذات سے منفصل ہے، تو وہ اگر مخلوق ہی نہیں؛ بلکہ اپنے آپ ہی موجود ہے، تو وہ خود خدا ہوگا، خدا اسی کو کہتے ہیں کہ خود بخود موجود ہو، اپنے موجود ہونے میں اس کو خالق کی ضرورت نہ ہو۔

اور اگر مادہ مذکور مخلوق ہے، تو پھر اس کے قدیم ہونے کی کوئی صورت نہیں؛ کیوں کہ جو چیز اپنے آپ موجود نہیں، کسی دوسرے کے موجود کرنے سے موجود ہے، تو اس کا وجود اس کا خانہ زاد نہ ہوگا، اسی کی عطا ہوگا، جس نے اس کو موجود کیا۔ اور اس وقت اس کی مثال ایسی ہوگی، جیسے زمین اپنے آپ منور نہیں، آفتاب کے منور کرنے سے منور ہوتی ہے، تو اس کا نور بھی عطائے آفتاب ہی ہوتا ہے، مثل نور آفتاب خانہ زاد نہیں ہوتا۔

الغرض اگر مادۂ مذکور مخلوق ہوگا، تو یہ معنی ہوں گے کہ خالق کے موجود کرنے سے

موجود ہوا، جس کا حاصل یہ ہوگا کہ اس کا وجود، اس کا خانہ زاد نہیں؛ بلکہ عطائے خالق ہے؛ مگر چوں کہ عطائے وجود مثل عطائے نور مذکور بے اس کے متصور نہیں کہ ادھر سے وجود آئے اور جیسے آفتاب سے نور اگر زمین پر واقع ہوتا ہے، اس پر وجود مشار الیہ آکر واقع ہو، تو خواہ مخواہ ایک حرکت کا ادھر سے ادھر کو تسلیم کرنا پڑے گا، جس کا مبدأ ادھر ہوگا اور منتہا ادھر۔ اور ظاہر ہے کہ حرکت کی وجہ سے جو چیز حاصل ہوتی ہے، اس میں عدم اول ہوتا ہے اور وجود دوم، یعنی حرکات مکانی اگر مثلاً ہوتی ہے، تو کس مکان تک پہونچنے سے پہلے یہ شخص اس مکان میں نہ تھا، بعد حرکت وہ مکان اس شخص کو میسر آیا اور یہ شخص اس مکان میں آسمایا؛ اس لیے یہ کہنا پڑے گا کہ اول وہ مادہ موجود نہ تھا، پھر بوجہ عطائے مذکور موجود ہوگیا۔ اور ظاہر ہے کہ یہ بات قدم کے مخالف ہے؛ بلکہ اسی کو حدوث کہتے ہیں۔

ہر انقلاب کو حرکت لازم:

علاوہ بریں ہر انقلاب کو حرکت لازم ہے۔ یہی وجہ ہے جو انقلاب طلوع وغروب کو دیکھ کر یہ یقین ہوجاتا ہے کہ آفتاب متحرک ہے، یا زمین متحرک ہے؛ ورنہ خود آفتاب اور زمین کی حرکت قطع نظر انقلاب مذکور سے آنکھوں سے یا کسی اور طریقے سے محسوس نہیں ہوتی۔ اور یہی وجہ ہے کہ علمائے علم ہیئت میں اس باب میں اختلاف ہے کہ آفتاب متحرک ہے، یا زمین متحرک ہے؟ اگر حرکت خود محسوس ہوتی، تو یہ اختلاف کیوں ہوتا؟ سب کے سب ایک ہی چیز کو متحرک کہتے۔

انقلابِ مکانی:

الحاصل انقلاب حرکت پر موقوف ہے، بے حرکت انقلاب متصور نہیں؛ ورنہ انقلاب کو دیکھ کر حرکت کا یقین نہ ہوا کرتا؛ مگر جس قسم کا انقلاب ہوتا ہے، اسی قسم کی حرکت ہوتی ہے اور اسی قسم کی حرکت سمجھ میں آتی ہے۔ انقلاب طلوع وغروب وغیرہ چوں کہ از قسم

انقلاب مکانی ہیں، تو حرکت مکانی کی طرف ذہن دوڑتا ہے، یعنی مثلاً جب یوں دیکھتے ہیں کہ بعد صبح آفتاب طلوع ہوا، تو اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ آفتاب مثلاً پہلے اور مکان میں تھا، اب افق پر آ گیا۔ علیٰ ہذا القیاس جب افق سے گزر کر سر پر آتا ہے، تو اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ مکان اول سے، جس کو افق کہتے ہیں، اس مکان میں آ گیا، جس کو نصف النہار کہتے ہیں؛ مگر چوں کہ یہ انقلاب مکانی ہے، تو حرکت مکانی ہی ذہن میں آتی ہے، حرکت کیفی، یا حرکت کمی، یا حرکت وضعی سمجھ میں نہیں آتی؛ اس لیے انقلاب وجود وعدم کو حرکت وجودی اور حرکت عدمی لازم ہوگی؛ مگر مخلوق ہونا ایک انقلابِ وجودی وعدمی ہے؛ کیوں کہ مخلوق اسی کو کہتے ہیں کہ پہلے نہ ہو، پھر موجود ہو جائے۔

اور ظاہر ہے کہ یہ انقلاب وجودی وعدمی ہے۔ جب اور انقلاب حرکت ہم جنس پر دلالت کرتی ہیں، تو یہ انقلاب کیوں کر حرکت ہم جنس پر دلالت نہ کرے گا۔ جس قدر اور انقلاب ہیں، وہ اسی قدر انقلاب کے متضمن ہونے کے باعث انقلاب کہلاتے ہیں۔ اگر یہ عام اور یہ مطلق اور انقلابات خاصہ اور مقیدہ میں ملحوظ اور ماخوذ نہ ہو، تو پھر ان انقلابوں کا انقلاب ہونا بھی غلط ہے۔

انقلاب مکانی کے یہی معنی ہیں کہ پہلے ایک چیز اس مکان میں نہ تھی، اب اس مکان میں موجود ہوگئی۔ غرض ہونا، نہ ہونا جس کا حاصل، وہی وجود وعدم ہے، انقلاب مکانی میں ملحوظ و ماخوذ ہوتا ہے اور اس سبب سے وہ انقلاب مذکور انقلاب کہلاتا ہے؛ اس لیے یہ ضرور ہے کہ اس انقلاب اعظم میں وہ بات بدرجہ اولی ہو، جو اور انقلابوں میں بوجہ انقلاب ہوتی ہے؛ مگر وہ کیا ہے؟ یہی حرکت ہے، جس کا ہم جنس انقلاب ہونا تقریر بالا سے روشن ہو چکا ہے؛ لیکن حرکتِ تجانس حرکت وجود وعدم، وہ حرکت وجودی وعدمی ہے؛ اس لیے حرکت وجودی کا مخلوقات میں ماننا ہر عاقل کے ذمہ ضرور ہے۔

انقلابِ زمانی:

اور اس وجہ سے اس کا تسلیم کرنا لازم آتا ہے کہ جیسے حرکت مکانی میں ہر دم نیا مکان آتا ہے، اور اس کے سبب وہ مکان اول جاتا ہے۔ ایسے ہی حرکت وجودی میں ہر دم ایک وجود آئے گا اور وجود سابق زائل ہو جائے گا، جس سے ہر دم ایک نئے عدم کا آنا لازم آئے گا۔ اس امتداد حرکت وجودی کو زمانہ سمجھیے؛ کیوں کہ زمانہ سے اوپر اور کوئی ایسی چیز نہیں، جس میں مثل حرکات وزمانہ ایک نئی بات ہو؛ اس لیے یہ یقین کامل ہوتا ہے، کہ زمانہ یہی حرکت وجودی ہے، جو سب حرکات میں اول اور سب سے اوپر ہے۔ اور کیوں نہ ہو، وجود سے اوپر اور کوئی چیز ہو، تو البتہ حرکت وجودی سے اوپر بھی کوئی حرکت ہو؛ مگر ہر چہ بادا باد جب حرکت وجودی واجب التسلیم ہوئی، تو بایں وجہ کہ حرکت میں اول عدم اور اور پھر وجود آتا ہے؛ چناں چہ اوپر عرض کر چکا ہوں۔

اور نیز ظاہر ہے کہ زمانہ اور عالم کے لیے ابتدا کا ہونا تو ضرور ہے اور انتہا کا ہونا ضروری نہیں؛ کیوں کہ عدم سابق خود حد اول ہو جائے گا، جن کا حاصل وہی ابتدائے وجود ہے، جو قدم عالم کے بالکل مخالف ہے۔ اور انتہا کی جانب چوں کہ وجود ہے، عدم نہیں، تو انتہا کا ہونا ضروری نہ ہوا۔ ہاں یہ بھی ضروری نہیں کہ برابر وجود ہی چلا جائے؛ اس لیے ابدیت، یعنی مستقبل کی جانب ہمیشگی اور انتہا دونوں برابر ہو گئے اور عقل کی رو سے کوئی بات معین نہ ہوئی، فقط مدار کار مشاہدہ پر رہا، یا اس بات پر کہ ارادۂ خالق و بانیٔ عالم کا کیا ہے؛ کیوں کہ جیسے اس مکان کا حال جو نیا بنایا جاتا ہے، عقل سے معلوم نہیں ہو سکتا، معلوم ہوتا ہے، تو یا تو مشاہدہ سے معلوم ہوتا ہے، جو بالیقین بعد وجود میسر آتا ہے، قبل وجود امکانِ مشاہدہ نہیں۔ یا بنانے والے سے معلوم ہوتا ہے کہ کیا بنائے گا، اور یہ بات قبل وجود بھی ممکن ہے۔ ایسے ہی عالم کی یہ کیفیت کہ کہاں تک بنتا جائے گا، یا تو مشاہدہ سے معلوم ہوگی، جو بالیقین آئندہ کی بات ہے، یا خدا کے بتلانے سے

معلوم ہو گی ؛ مگر حسب تقریر وعظ مشار الیہ خدا تعالیٰ بجز انبیاء علیہم السلام اور کسی کو راز کی باتوں کی اطلاع نہیں کرتا ؛ اس لیے در بارۂ ابدیت وانتہائے عالم انبیاء کے بیان کی پابندی ضرور ہے۔ انہوں نے بحوالۂ خداوندی اطلاع کر دی کہ ایک روز نہ ایک روز یہ عالم نیست و نابود ہو کر پردۂ عدم میں مستور ہو جائے گا اور پھر بعد مدت سب کو از سرے نو پیدا کر کے اپنے اپنے کردار کو پہونچائیں گے۔

اسی قسم کے مضامین مولوی صاحبؒ بیان کر رہے تھے، جو مدت معینہ بیان پوری ہو گئی ؛ اس لیے وہ تو بیٹھے اور گمان غالب یہ ہے کہ ان کے بعد پھر پنڈت جی کھڑے ہوئے ؛ کیوں کہ موافق ترتیب درس اول، بعد اہل اسلام ہنود ہی کا نمبر تھا اور ہنود میں سوائے پنڈت صاحب اور کوئی صاحب اول سے آخر تک کھڑے ہی نہ ہوئے، جو اور کسی کا احتمال ہوتا ؛ اس لیے یہی گمان ہوتا ہے کہ بعد مولوی صاحبؒ متصل ہی پنڈت صاحب کھڑے ہوئے۔ اگر چہ یہ بھی احتمال ہوتا ہے کہ عیسائیوں کی طرف بعض دیسی پادری جو اس جلسہ میں کھڑے ہوئے تھے اور ایسی لاطائل تقریریں کی تھیں کہ جن کو سننے کو بھی اہل جلسہ میں سے کسی کا جی نہیں چاہتا تھا، چہ جائے کہ یادر ہتیں، وہ بعد مولوی صاحب کھڑے ہوئے ہوں ؛ مگر اتنا یقیناً یاد ہے کہ سب میں پچھلی تقریر جو اس جلسہ میں ہوئی، وہ پنڈت صاحب کی تقریر تھی اور یہ بھی یاد ہے کہ پنڈت صاحب ایک دو بار وقت اعتراض عیسائیوں پر اعتراض کر کے جب تقریر ختم کرنے کو ہوئے، تو یہ کہا کہ : کیا کہیے، وقت ہو چکا ؛ ورنہ مولوی صاحب کی بات کا بھی کچھ جواب دیا جاتا۔

خدا جانے یہ ان کا ارشاد واقعی تھا، یا جیسا بظاہر معلوم ہوتا تھا، مولوی صاحب کی تقریر پر لاجواب ہو کر یہ چال چلتے تھے ؛ مگر ہاں اخیر تقریر میں جس کے بعد جلسہ ہی برخاست ہو گیا، مولوی صاحب کی تقریر پر یہ اعتراض کیا کہ :

مادۂ عالم صفتِ وجودِ خداوندی ہونے پر پنڈت جی کا اعتراض:

اگر مادۂ عالم حسب تقریر مولوی صاحب صفتِ وجودی خداوندی ہو، تو خدا کا برائی کے ساتھ موصوف ہونا لازم آئے گا؛ کیوں کہ مخلوقات میں بھلے برے سب ہیں۔ اگر بھلوں کا وہ مادہ ہے، تو بروں کا بھی وہی مادہ ہوگا اور اس لیے اس کا برا ہونا لازم آئے گا۔

حضرت نانوتویؒ کا جواب اور پادری و پنڈت فرار:

پنڈت جی تو یہ فرما کر فارغ ہوے اور مولوی صاحب اس چوکی پر پہونچے؛ مگر چوں کہ گیارہ بج گئے تھے، یا بجنے کو تھے، تو پادریوں نے فرمایا کہ: بس جلسہ کا وقت ہو چکا۔ مولوی صاحب نے فرمایا: دو چار منٹ ہماری خاطر سے اور ٹھہریے، بندۂ درگاہ جھٹ پٹ پنڈت جی کے اعتراض کا جواب عرض کیے دیتا ہے؛ مگر پادریوں نے نہ مانا۔

اس پر مولوی صاحب نے پنڈت صاحب سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ: پنڈت صاحب! فقط آپ ہی ٹھہر جائیں، وقت جلسہ ہو چکا ہے، تو کیا ہوا، دو چار منٹ خارج جلسہ ہی سہی؛ مگر پنڈت جی نے بھی نہ مانا اور یہ فرمایا کہ: اب بھوجن کا وقت آ گیا ہے، اب ہم سے کچھ نہیں ہو سکتا۔

جب مولوی صاحب نے دیکھا کہ پنڈت صاحب بھی نہیں مانتے اور کیوں کر مانتے، انجام کار آغاز سے نظر آتا تھا، تو بناچاری مولوی صاحب نے منشی اندر من صاحب کا ہاتھ پکڑ کر یہ فرمایا کہ: منشی صاحب! پنڈت صاحب تو نہیں سنتے، آپ ہی سنتے جائیں اور یہ کہہ کر فرمایا کہ: میں اس اعتراض کا جواب ضمن مثال میں وقت بیان اصل مطلب دے چکا ہوں؛ مگر پنڈت صاحب نے اس کا کچھ خیال نہ کیا اور جو اعتراض نہ کرنا تھا، اوروں کے سنانے کو کر گئے ہیں۔

خلاصۂ جواب:

کہہ چکا ہوں کہ مخلوقات کو خدا تعالیٰ اور اس کے وجود کے ساتھ جو اس کے حق

میں بمنزلۂ شعاعہائے آفتاب ہے، ایسی نسبت ہے، جیسے دھوپوں کی تقطیعات مختلفہ کو جو روشندانوں کے کینڈوں اور صحن خانوں کے پیمانوں کے مطابق ہوا کرتے ہیں، آفتاب اور اس کی شعاعوں کے ساتھ ہوا کرتی ہے۔

جس شخص نے اس مثال کو غور سے سنا ہوگا، وہ سمجھ گیا ہوگا کہ جیسے تقطیعات مذکورہ کی بھلائی برائی اور سوا ان کے اور احکام مختلفہ انہیں اشکال وتقطیعات تک رہتی ہیں، آفتاب اور نورِ آفتاب۔ یعنی شعاعِ آفتاب تک نہیں پہونچتی۔ ایسے ہی مخلوقات کی بھلائی برائی خدا تعالی اور اس کے وجود تک نہیں پہونچ سکتی۔ اگر کوئی مثلث شکل کی دھوپ ہوگی، تو بے شک اس کے تینوں زاویے مل کر دو قائموں کے برابر ہوں گے، اور اسی کے دو ضلع مل کر تیسرے خط سے بڑے ہوں گے؛ مگر ظاہر ہے کہ ان باتوں کو ذات آفتاب اور اس کے اصل نور تک رسائی نہیں۔ آفتاب اور اس کے نور میں نہ زاویہ، نہ اضلاع، جو یہ احکام اس میں جاری ہوں۔

علی ہذا القیاس مخلوقات کی تقطیعات کے احکام خدا تعالی اور اس کے وجود تک نہیں پہونچ سکتے: کیوں کہ وہاں نہ یہ تقطیعات، نہ ان کے لوازم، جو بھلائی برائی کو، جو اس کے خواص میں سے ہیں، اس تک رسائی ہو، اور اس سبب سے اس کا برا ہونا لازم آئے۔

یہ کہہ کر فرمایا: آپ پنڈت صاحب کو یہ جواب سنا دیں۔ منشی صاحب نے فرمایا: شاید وہ اس مضمون پر اور کچھ اعتراض کریں۔ مولوی صاحب نے فرمایا: اس بات کا جواب پنڈت جی سے قیامت تک نہ آئے گا۔ یہ کہہ کر مولوی صاحب تو مع رفقاء اپنے ڈیرہ کی طرف چل دیے اور منشی صاحب وغیرہ اپنی اپنی فرودگاہوں کی طرف روانہ ہوے؛ مگر مولوی صاحب ابھی خیمہ تک نہ پہونچے تھے، جو پادری نولس صاحب اور ایک اور ولایتی پادری جھپٹ کر آئے اور مولوی صاحب سے فرمانے لگے: آج چار بجے کے بعد پادری اسکاٹ صاحب درس دیں گے۔ آپ بھی اس درس میں تشریف

لائیں گے۔

پادری نولس حضرت نانوتویؒ کی خدمت میں:

مولوی صاحب نے فرمایا: کل جو ہم نے آپ سے ایک گھنٹہ کی اجازت لے کر ایک گھنٹہ تک اپنے مذہب کے فضائل اور اس کی حقانیت خارج از جلسہ چار بجے کے بعد بیان کیے تھے، تو اس کی یہ وجہ ہوئی تھی کہ آپ جلسہ میں اتنا وقت نہ دیتے تھے کہ کوئی دل کھول کر بیانِ فضائل کر سکے۔ جب ہم نے آج آپ کو وقت میں وسعت دے دی، تو پھر خارج از جلسہ تکلیف کرنے سے کیا فائدہ؟

پادری صاحب نے فرمایا کہ: اب تو آپ مہربانی کر کے اس بات کو قبول ہی کر لیں۔

مولوی صاحب نے فرمایا: بہت بہتر، اگر پادری صاحب درس دیں گے، تو ہم بھی ان شاء اللہ تعالیٰ! سنیں گے۔

پادری صاحب نے پوچھا: آپ اعتراض کریں گے؟

مولوی صاحب نے فرمایا: اگر اعتراض کی اجازت ہوگی، تو بے شک اعتراض کریں گے۔

پادری صاحب نے فرمایا: اعتراض کے لیے آپ کو کتنا وقت چاہیے؟

مولوی صاحب نے فرمایا: وقت کی تحدید کے کیا معنی، پہلے سے کون شخص اپنے مطالب کو ناپ تول کر لاتا ہے، جو اس کے موافق وقت مقرر کیا جائے۔ وقت اگر مقرر کیا جاتا ہے، تو اس اندیشہ سے کیا جاتا ہے کہ مبادا کوئی شخص مفت مغز زنی کرنے لگے۔ اگر وقت محدود نہ کیا جائے گا، تو ایسا شخص بے وجہ مغز کھائے گا اور سوا اس کے کسی کو بولنے کی گنجائش نہ ملے گی؛ مگر آپ ہی انصاف سے فرمائیں کہ میں کون سی بات لغو اور بیہودہ کہتا ہوں، جو آپ میرے لیے وقت کو محدود کرتے ہیں۔

پادری نولس صاحب نے فرمایا: نہیں، آپ بیہودہ باتیں نہیں کرتے۔

مولوی صاحب نے فرمایا: پھر کس لیے آپ میرے واسطے وقت کو محدود کیے دیتے ہیں۔

پادری نولس صاحب نے فرمایا: اچھا آپ کے لیے وقت کی کوئی تحدید نہ سہی؛ مگر دوسرے پادری صاحب نے کہا: نہیں، وقت کو ضرور محدود کرنا چاہیے، نہیں تو ہر شخص یوں جتنا چاہے گا، بیان کیے جائے گا۔

پادری نولس صاحب نے مولوی صاحب سے فرمایا: آپ کے بیس منٹ سہی، اور اوروں کے لیے دس منٹ۔

اثنائے راہ میں جب یہ فیصلہ ہو چکا، تو پھر سب صاحب اپنے اپنے ٹھکانے پر پہونچے اور قضائے حوائج اور ادائے ضروریات میں مشغول ہوے۔ کھانا کھا ہی رہے تھے، جو موتی میاں صاحب نے مولوی محمد قاسم صاحبؒ سے فرمایا: پادری اسکاٹ صاحب آپ کی تعریف کرتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ اس شخص کی باتیں بہت ٹھکانے کی ہیں، یہ مولوی نہیں، صوفی مولوی ہے۔ مولوی سخاوت حسین صاحب سہسوانی، وکیل عدالت دیوانی بھی اس وقت اتفاق سے آ نکلے، وہ بھی فرمانے لگے کہ پادری صاحب مولوی محمد قاسم صاحب کو کہتے تھے کہ یہ شخص صوفی مولوی ہے۔ ادھر اثنائے جلسہ میں جب مولوی صاحب کھڑے ہوتے تھے، تو تمام جلسہ میں ایک سکتہ کا عالم ہو جاتا تھا، اور جب مولوی صاحب کسی تقریر سے فارغ ہوتے تھے، تو اکثر صاحبوں کی زبان سے صدائے آفرین و تحسین سنائی دیتی تھی۔

غرض غلبۂ جانب اسلام ایسا نمایاں تھا کہ بجز ناانصاف حاضرانِ جلسہ میں سے کوئی شخص اس کا انکار نہیں کر سکتا تھا۔ شاید یہ ثمرۂ انکسار مولوی صاحب اور دعائے اہل اسلام تھا۔

مولوی صاحب نے جب سے شاہ جہاں پور کا ارادہ کیا تھا، جس سے ملتے تھے، یا

جس کو اہل دعا سمجھتے تھے، استدعائے دعا کرتے تھے۔ خود یہ کہتے تھے کہ ہر چند ہماری نیت اور ہمارے اعمال اسی قابل ہیں کہ ہم مجمع عام میں ذلیل وخوار ہوں؛ مگر ہماری ذلت وخواری میں اس دین برحق کی ذلت اور اس پاک رسول ﷺ کی ذلت متصور ہے، جو تمام عالم کا سردار اور تمام انبیاء کا قافلہ سالار ہے؛ اس لیے خود بھی یہی دعا کرتے تھے اور اوروں سے بھی دعا کراتے تھے کہ الٰہی ہماری وجہ سے اپنے دین اور اپنے حبیب پاک، شہِ لولاک ﷺ کو ذلیل وخوار مت کر، اپنے دین اور اپنے حبیب پاک کی بدولت اور طفیل میں ہم کو عزت اور افتخار سے مشرف فرما۔

القصہ اہل اسلام کو کھانے سے فارغ ہو کر نماز کا فکر ہوا، بارہ بجتے ہی وضو کر کرا کر نماز کی ٹھہرائی۔ نماز ظہر سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ جو ایک بج گیا؛ اس لیے دوسرے جلسہ کے لیے سب صاحب تیار ہوئے۔

کیفیت جلسۂ سوم بروز دوم

منشی پیارے لال اور پادریوں کا باہمی اتفاق:

ایک بجتے ہی مناظر اور شائقانِ مناظرہ میدانِ مناظرہ کی طرف روانہ ہوئے۔ اہل اسلام بھی ادھر سے بسم اللہ کر کے پہونچے۔ گفتگو شروع ہونے سے پہلے منشی پیارے لال صاحب نے یہ کہا کہ: میں چاہتا ہوں کہ صرف سوال اخیر پر مباحثہ ہووے اور باقی سوالات پر مباحثہ ملتوی کی جائے۔

وجہ اس کی کچھ معلوم نہ ہوئی؛ مگر قرینہ اس بات کو مقتضی ہے کہ یہ بات فقط بنظر اتباع حضرات پادریانِ نصاریٰ تھی۔ انہیں کی طرف سے صبح کو یہ اصرار ہوا تھا کہ پہلے مسئلۂ رابع میں گفتگو ہو جائے۔ سو اس وقت مسئلۂ رابع کے بدلے مسئلہ خامس کا لینا اس غرض سے ہوگا کہ بالکل راز نہ کھل جائے۔ غرض مسئلۂ ثانی و ثالث تو مثل مسئلۂ اول علوم حقائق و فلسفہ سے متعلق تھا۔ پادریوں کو بوجہ ناواقفیت علوم مذکورہ ان کی جواب دہی مشکل نظر آئی؛ البتہ مسئلۂ رابع و خامس فقط مذہب سے متعلق تھے اور ان کے بیان کا اکثر اتفاق رہتا ہے؛ اس لیے صبح کو تو اس پر اصرار رہا کہ مسئلۂ رابع میں گفتگو ہو۔ اس وقت تو نہ ان کے پاس کوئی حجت اپنے اصرار کی نظر آئی اور نہ منشی پیارے لال سے ساز کی گنجائش ملی۔ اس مہلت اور تنہائی میں جو گیارہ بجے سے لے کر ایک بجے تک تھی، کیا عجب ہے کہ منشی صاحب سے اس بات میں کہہ سن لیا ہو؛ ورنہ صبح تک تو منشی صاحب کا بھی یہی قول تھا کہ ترتیب وار سوالات معلومہ میں گفتگو ہو۔

علاوہ بریں پہلے روز منشی صاحب کا بات بات میں پادریوں کی تائید کرنا، جس کی

وجہ سے اہل اسلام خصوصاً مولوی محمد طاہر صاحبؒ اور مولوی محمد قاسم صاحبؒ کو ان کی شکایت کی نوبت آئی اور وہ ارتباط دلی، جو منشی صاحب کو پادریوں کے ساتھ مشہور ہے اور مسائل مذکورہ کا حقائق وفلسفہ سے متعلق ہونا اور پادریوں کا ان علوم سے بے بہرہ ہونا زیادہ تر اس خیال کا مؤید ہے کہ ہو نہ ہو، یہ پادری صاحبوں کی ہی چالاکی تھی۔ بایں ہمہ پہلے روز پادری نولس صاحب کا بار بار یہ کہنا: ''ہم کو زیادہ فرصت نہیں، آج کل ہی ٹھہر سکتے ہیں''۔ اور بھی اس خیال کے لیے قرینۂ صادقہ ہے۔ اگر چہ اس وقت مولوی صاحب نے کھلم کھلاّ یہ فرمایا کہ یہ بات ہمارے کہنے کی تھی، باوجود افلاس و بے سروسامانی قرض وام لے کر، اپنی ضرورتوں پر خاک ڈال کر، ایک مسافت دور و دراز قطع کر کے یہاں تک پہونچے۔ پھر اس پر یہ قول ہے کہ جب تک حسب دل خواہ فیصلہ نہیں ہو جائے گا، نہ جائیں گے۔ اور آپ صاحب تو اسی کام کے نوکر، آنے جانے میں کوئی دقت نہیں، اس کے کیا معنی کے آپ کو فرصت نہیں؟ یہ عذر کرتے، تو ہم کرتے؛ مگر اس پر بھی پادری صاحبوں کو کچھ اثر نہ ہوا، اور کیوں ہوتا، قلت فرصت کا بہانہ کر کے مباحثہ کو مختصر کر دینا اس سے آسان نظر آیا کہ اہل اسلام کے مقابلہ میں مغلوب ہوں اور کوئی عذر نہ ہو۔ آخر اہل اسلام کو دیکھے بھالے تھے، اور کچھ فی الحال دیکھا۔ اور کیا عجب ہے پنڈت صاحب اور منشی اندرمن صاحب کی بھی یہی رائے ہو، منشی اندرمن صاحب کا اول سے آخر تک نہ بولنا؛ بلکہ باوجود اصرار مولوی محمد قاسم وضرورت بیان مطالب پنڈت صاحب ان کا یہ کہہ دینا ''مجھ کو کبھی لیکچر دینے کا اتفاق نہیں ہوا، جو لوگ یہ کام کرتے رہتے ہیں، انہیں سے یہ کام ہو سکتا ہے'' بجز اس کے اور کس بات پر محمول ہو سکتا ہے کہ علاوہ شور غلبۂ اہل اسلام بہ نسبت سال گزشتہ اس سال میں پہلے روز اہل اسلام کی جودت طبعی اور خوش بیانی اور ان کے مطالب کی خوبی اور تسلسل معانی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے اور پنڈت صاحب بھی اگر چہ مولوی محمد قاسم

صاحب اور مولوی ابوالمنصور صاحب کی حسن لیاقت کی داد دے چکے تھے؛ مگر دنیا بامید قائم، یوں سمجھ کر کہ شاید علوم حقائق اور علوم فلاسفہ کی طرف بوجہ فقدان اسباب توجہ علوم مذکورہ توجہ نہ ہو، اور اس وجہ سے کیا عجب ہے کہ سوالات مذکورہ کے جواب میں رہ جائیں اور ہم بایں وجہ کہ خود ہی ان سوالات کے مجوز ہیں، ان کے جوابوں کو مستحضر کر رکھا ہے، میدان مناظرہ میں اہل اسلام سے گوئے سبقت لے جائیں، اول سینہ سپر ہو گئے تھے؛ مگر قِدمِ عالم کے ابطال اور مادۂ عالم کے بیان کو اہل اسلام سے سن کر وہ بھی ٹھنڈے ہو گئے تھے۔

غرض ان وجوہ سے عجب نہیں کہ منشی اندر من صاحب اور پنڈت دیانند صاحب بھی اسی طرف مشیر ہوے ہوں اور مشیر بھی نہ ہوے ہوں، تو مانع بھی نہ ہوے ہوں؛ مگر ہر چہ بادا باد اس وقت بہ مجبوری اہل اسلام کو یہی ماننا پڑا کہ اس وقت مسئلۂ خامس میں ہی گفتگو ہو جائے؛ لیکن اس ردوکد میں آدھا گھنٹہ گزر گیا اور چار بجنے میں فقط اڑھائی گھنٹے باقی رہ گئے؛ اس لیے یہ تجویز ٹھہری کے یہ جلسہ ساڑھے چار بجے تک رہے۔ اہل اسلام نے کہا: خیر کچھ مضائقہ نہیں، آج نماز عصر آدھ گھنٹہ بعد ہی پڑھ لیں گے۔

پادری اسکاٹ اور سوالِ خامس کا جواب:

الغرض گفتگو شروع ہوئی، اول پادری اسکاٹ صاحب کھڑے ہوے اور سوال خامس، یعنی اس سوال کے جواب میں کہ ''نجات کسے کہتے ہیں اور نجات کا کیا طریقہ ہے''؟ ایک تقریر طویل بیان کی، جس کا خلاصہ یہ تھا کہ: نجات گناہوں سے بچنے کو کہتے ہیں؛ مگر جب خدا تعالیٰ نے یہ دیکھا کہ تمام عالم گناہوں میں ڈوبا جاتا ہے، تو خود مجسم ہو کر آیا اور عیسی مسیح کہلایا اور سب خلائق کا کفارہ بنا۔ یعنی بارِ گناہاں بنی آدم اپنے سر پر رکھ کر اس کی سزا میں مصلوب ہوا، اور پھر نعوذ باللہ! ملعون ہو کر تین دن جہنم میں رہا؛ اس لیے سب پر لازم ہے کہ عیسی مسیح کی الوہیت پر ایمان لائیں اور دین عیسائی

اختیار کریں، بدون اس کے نجات نہیں اور گناہوں سے بچاؤ نہیں ہو سکتا۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ میں نے یہ دعا کی کہ: اے عیسیٰ مسیح! میرے حال پر نظر عنایت فرما۔ اس کے بعد میرے دل میں ایسا چین آیا اور ٹھنڈک معلوم ہوئی کہ میں بیان نہیں کر سکتا، بالکل اور باتوں سے دل بھر گیا۔

ایسے ہی ایک دن کا ذکر ہے کہ ایک شخص بڑا تندرست تھا اور موٹا تھا۔ جیسے ہمارے پنڈت جی اور وہ بڑا اشریر تھا، کبھی گرجا میں نہ جاتا تھا، نہ انجیل سنتا تھا۔ میں نے اس سے کہا: تو انجیل سنا کر۔ اس نے کہا: میں کیوں انجیل سنوں اور کیوں گرجا میں آؤں؟ آخر میں نے اس کو انجیل سنائی۔ دوسرے روز اس کے دل پر ایسا اثر ہوا کہ خود بخود وہ میرے پاس آیا اور سب برائیاں چھوڑ دیں اور صدق دل سے نیک وصالح ہو گیا اور تمام لوگوں میں یہ بات مشہور ہوگئی کہ فلاں شریر آدمی نیک آدمی ہو گیا۔

ادھر دیکھو جب تک عیسائیوں کی عمل داری ہندوستان میں نہیں تھی، ہندوستان میں کیسی کیسی غارت گری اور فتنہ وفساد اور رہزنی ہوا کرتی تھی۔ جب سے عیسائیوں کی عمل داری ہوئی، کس قدر امن وامان ہو گیا۔ سونا اچھالتے چلے جاؤ، کوئی نہیں پوچھتا۔ دیکھو کتنی گناہوں میں کمی آگئی۔ یہ ایک بڑی دلیل ہے حقّیت عیسائی مذہب کی۔

پنڈت دیانند اور پادری اسکاٹ پر جرح:

بعد اس کے پنڈت دیانند سرستی صاحب کھڑے ہوے اور انہوں نے بھی ایک تقریر طویل بیان فرمائی۔ خلاصہ اس تقریر کا بعض ان صاحبوں کے بیان کے موافق، جو کسی قدر ان کی زبان سمجھتے تھے، یہ ہے کہ مکت یعنی نجات اس میں ہے کہ آدمی گناہوں سے بچے اور نیک کام کرے۔ اور پادری صاحب نے جو یہ بیان کیا کہ خدا تعالیٰ مجسم ہو کر آیا، خلائق کے گناہوں کا کفارہ ہوا، سراسر غلط ہے؛ یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ وہ ذات پاک جس کی کوئی حد ونہایت نہیں، وہ ایک مٹھی میں آجاوے اور پادری صاحب جو اپنے مذہب

کو گناہوں سے نجات کا سبب سمجھتے ہیں، یہ تو صاف بے اصل بات ہے۔ حضرت موسیٰؑ کو صاف حکم ہوا تھا کہ مکان مقدس میں جوتا اتار کر آؤ، ہمارے پادری صاحب برعکس اس کے جوتے کی جگہ ٹوپی اتارتے ہیں اور جوتا پہنے رہتے ہیں اور بہت باتیں برخلاف خدا کے حکم کے کرتے ہیں اور ان کو روا سمجھتے ہیں۔ پس ایسے مذہب میں نجات کسی طرح نہیں ہوسکتی۔

حضرت نانوتویؒ اور سوالِ خامس کا تشفی بخش جواب:

بعد اس کے مولوی محمد قاسم صاحبؒ کھڑے ہوے اور یہ فرمایا کہ نجات قہر الٰہی اور عذاب الٰہی سے بچ جانے کو کہتے ہیں؛ مگر طریق حصول نجات بجز احتراز معصیت و گناہ اور کچھ نہیں؛ اس لیے یہ بات گناہ کے دریافت کرنے پر موقوف ہے۔ پادری صاحب و پنڈت صاحب نے تو یہ فرمایا کہ نجات گناہوں سے بچنے کو کہتے ہیں، یا نجات گناہوں سے بچنے میں ہے؛ مگر یہ نہ فرمایا کہ گناہ کس کو کہتے ہیں۔ گناہ کی دو چار مثالیں اور دو چار قسمیں تو مثل زنا و چوری وغیرہ بیان کی۔ پر اس کی تعریف کچھ بیان نہ فرمائی۔ سو ہم اول تعریف گناہ بیان کرتے ہیں: سنیے!

گناہ کس کو کہتے ہیں؟:

گناہ خلاف مرضیِ الٰہی کو کہتے ہیں اور طاعت موافق مرضی الٰہی کا نام ہے؛ مگر کل ہم عرض کر چکے ہیں، مرضی اور غیر مرضی تو ہماری بھی بے ہمارے بتلائے کسی کو معلوم نہیں ہوسکتی۔ اگر سینہ سے سینہ ملا دے؛ بلکہ دل کو چیر کر دکھلا دے، تب بھی دل کی بات نظر نہ آئے، جب تک زبان نہ ہلائے، یا اشارہ سے اطلاع نہ فرمائے، تب تک مرضی و غیر مرضی کی اطلاع دوسروں کو ممکن نہیں۔ باجود کثافت اور اس ظہور کے کہ ہم جسمانی ہیں، یہ حال، تو خداوند عالم تو کمال ہے، درجہ لطیف ہے، اس کے دل کی بات بے اس کے بتلائے کسی کو کیوں کر معلوم ہوسکتی ہے۔ عقل نارسا کو اتنی رسائی کہاں کہ اس کی مافی الضمیر تک پہونچے، عقل سے ہوسکتا ہے، تو اتنا ہی ہوسکتا ہے کہ کسی بات کا

حسن وقبح کسی قدر معلوم کرلے۔سو یہ بات بھی اول تو ہر بات میں متصور نہیں، جو عقل ہی کے بھروسے بیٹھ رہیے، دوسرے خداوند کریم گو علیم وحکیم ہے، اور اس وجہ سے یہ اعتقاد ہے کہ نہ اچھی بات سے منع فرمائے، نہ بری بات کا ارشاد فرمائے؛ لیکن تاہم خدا ہے، بندہ نہیں، حاکم ہے، محکوم نہیں، عقل کا مطیع نہیں، عقل اس کی مطیع ہے؛ اس لیے اگر بالفرض وہ زنا کو حلال اور طاعت کو حرام کردے، تو بے شک زنا طاعت اور طاعت گناہ ہوجائے۔بقول شخصے :شعر:

گر طمع خواہد زمن سلطانِ دیں
خاک بر فرق قناعت بعد ازیں

انبیاء علیہم السلام کی ضرورت کیوں؟:

اس لیے بندہ کے ذمہ ضرور ہے کہ مرضی، غیر مرضی کے دریافت کرنے میں اسی کی طرف نظر رہے، اپنی عقل نارسا کو اس قصہ سے علی حدہ رکھے؛ مگر ہم عرض کرچکے ہیں کہ بادشاہانِ دنیا اس تھوڑی سی نخوت پر اپنا مافی الضمیر ہر کسی سے کہتے نہیں پھرتے، خداوند عالم اس تکبر اور بے نیازی پر، جس پر اس کی خدائی خود دلالت کرتی ہے؛ کیوں کر اپنے دل کی بات ہر کسی سے کہتا پھرے گا۔ یہاں تو مخلوقیت سے لے کر انسانیت تک سب باتوں میں اشتراک، خدا اور مخلوقات میں تو کسی بات میں بھی اشتراک نہیں؛ اس لیے بادشاہان دنیا جیسے اپنے مافی الضمیر کی اطلاع اپنے مقربانِ خاص کے ذریعہ کرادیتے ہیں۔ ایسے ہی بلکہ بدرجہ اولیٰ خداوند عالم بھی اپنا مافی الضمیر بذریعہ مقربان خاص اوروں کو سنادے گا۔انہیں مقربوں کو ہم لوگ ''انبیاء اور رسول'' کہتے ہیں؛ اس لیے انبیاء علیہم السلام کی اتباع اور اقتدا ہی میں نجات منحصر ہوگی؛ کیوں کہ اس صورت میں ان کی اطاعت خاص خدا کی اطاعت ہوگی اور ان کی نافرمانی خاص خدا کی نافرمانی ہوگی؛مگر جیسے ہر زمانے میں ایک جدا حاکم ہوتا ہے، پہلے

زمانہ میں اگر لارڈ نارتھ بروک گورنر تھے، تو آج لارڈلٹن ہے، پہلے اور کلکٹر تھا اور اب اور کلکٹر ہے۔ ایسے ہی ہر زمانہ میں مناسب وقت ایک جدا ہی نبی ہوگا۔ جیسے آج کل لارڈلٹن کے احکام کی تعمیل ضرور ہے، لارڈ نارتھ بروک کے احکام کی تعمیل سے کام نہیں چلتا۔ ایسے ہی ہر زمانہ میں اس زمانہ کے نبی کے احکام کی تعمیل ضرور ہے۔ حضرت موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کی بزرگی اور نبوت مسلّم، ان کا منکر ہمارے نزدیک ایسا ہی کافر ہے، جیسے رسول اللہ ﷺ کی نبوت کا منکر ہمارے نزدیک کافر ہے۔

نجات اتباعِ محمدی پر منحصر:

علی ہذا القیاس شری رام چندر اور شری کرشن کو بھی ہم کچھ نہیں کہہ سکتے، پر آج کل نجات کا سامان بجز اتباع نبی آخر الزماں محمد رسول اللہ ﷺ اور کچھ نہیں۔ جیسے اس زمانہ میں باوجود تقرر گورنرِ حال لارڈلٹن، گورنرِ سابق لارڈ نارتھ بروک کے احکام کی تعمیل پر اگر کوئی شخص اصرار کرے، اور لارڈلٹن کے احکام کی تعمیل سے انکار کرے، تو باوجود اس کے کہ لارڈ نارتھ بروک بھی سرکار ہی کی طرف سے گورنر تھا، اس وقت میں یہ اصرار بے شک من جملہ بغاوت اور بمقابلہ سرکاری سمجھا جائے گا۔

ایسے ہی اگر کوئی شخص اس زمانہ میں رسول اللہ ﷺ کو چھوڑ کر اوروں کا اتباع کرے، تو بے شک اس کا یہ اصرار اور یہ انکار از قسم بغاوت خداوندی ہوگا، جس کا حاصل کفر والحاد ہے۔

القصہ اس وقت اتباع حضرت عیسیٰ علیہ السلام وغیرہم ہرگز باعث نجات نہیں ہوسکتا۔ ہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام وغیرہم اگر خاتم الانبیاء ہوتے، تو پھر بے شک نجات ان ہی کے اتباع میں منحصر ہوجاتی؛ لیکن ایسا ہوتا، تو بالضرور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سد باب ضلالت کے لیے دعویٔ خاتمیت کرتے، تاکہ آئندہ کو لوگ اوروں کے اتباع سے گمراہ نہ ہوجائے۔ انبیاء کا یہ کام نہیں کہ ایسے موقع میں چپ کے بیٹھے رہیں اور

آدمیوں کو گمراہ ہونے دیں؛ مگر سب جانتے ہیں سوائے حضرت رسول عربی محمد رسول اللہ ﷺ اور کسی نے دعوئ خاتمیت نہیں کیا۔ اگر کرتے، تو حضرت عیسی علیہ السلام کرتے، انہوں نے بجائے دعوئ خاتمیت، الٹا یہ فرمایا کہ: میرے بعد جہاں کا سردار آنے والا ہے، اس سے بروئے انصاف آشکارا ہے کہ وہ آنے والا خاتم الانبیاء ہوگا؛ کیوں کہ تمام انبیاء اپنے اپنے رتبوں کے موافق امتیوں کے سردار اور ان کے حاکم ہوتے ہیں۔ اور کیوں نہ ہو، ان کی اطاعت امتیوں کے ذمہ ضرور ہوتی ہے؛ اس لیے جو سب کا سردار ہوگا، وہ سب کا خاتم ہوگا؛ کیوں کہ وقت مرافعہ بادشاہ کا حکم سب میں آخر رہتا ہے، یہ اس کی خاتمیت حکومت خاصی اسی وجہ سے ہے کہ وہ سب کا سردار ہوتا ہے۔

الغرض اتباعِ محمدی (ﷺ) اب تمام عالم کے ذمہ لازم ہے۔ انہوں نے دعوئ نبوت کے ساتھ دعوئ خاتمیت بھی کیا اور وہ معجزے دکھلائے کہ اوروں کے معجزے ان کے سامنے کچھ نسبت نہیں رکھتے۔ چناں چہ بطور مشتے نمونہ ازخروارے کل بعض معجزات کی تفصیل اور انبیائے دیگر کے معجزات پر ان کی فوقیت اور افضلیت ہم بیان بھی کر چکے ہیں۔ پھر اب ان کے اتباع میں کیا تأمل ہے۔ خاص کر قرآن شریف ایک ایسا عمدہ معجزہ ہے کہ کوئی اس کے برابر نہیں ہوسکتا۔ رہا ثبوت الوہیت، یہ ایک ایسا عقیدۂ مہمل ہے کہ کوئی عاقل تسلیم نہیں کر سکتا۔

ہم کو عقلائے فرنگ کی عقل پر بڑا افسوس آتا ہے کہ سب کے سب ایسی موٹی غلطی میں پڑے ہوے ہیں۔ اوروں پر کیسے کیسے خفیف اعتراض کرتے ہیں، جن کی جواب دہی کے لیے عقلاء کو تأمل کی حاجت نہیں اور اپنے آپ ایسے ایسے اعتراض سر پر لیے بیٹھے ہیں، جن کا جواب قیامت تک نہیں آسکتا۔

حضرت نانوتویؒ اور پادری اسکاٹ کی سخت گرفت:

افسوس، ہزار افسوس! وہ خداوند کریم جو ہر طرح سے مقدس اور ہر وجہ سے بے

نیاز اور تمام عیوب اور جملہ نقصانوں سے پاک ہے، اس کو تو اس پیرائے میں کہ عیسی مسیح بن کر مجسم ہوا، اور زمین پر آیا اور کھانے پینے، بول و براز، بھوک پیاس، خوشی غم وغیرہ حوائج انسانی میں مبتلا ہوا، کہیں سولی پر چڑھا، کہیں یہودیوں کے ہاتھوں میں مقید ہوکر ''ایلی ایلی'' پکارا، کہیں معذب اور ملعون ہوکر اوروں کے لیے کفارہ بنا۔ کیا کیا کچھ برا بھلا کہہ لیتے ہیں۔ اگر کوئی شخص پادری صاحب کو چمار کہہ دے، تو ابھی مارنے مرنے کو تیار ہو جائے۔ یہ کیسا ظلم صریح ہے کہ اپنے آپ کو ذرا بھی کوئی برا کہہ دے، تو پھر خیر نہیں، اور خداوند قدوس کو جو چاہیں کہہ لیں۔ چمار اور پادری صاحب میں کیا فرق ہے، وہ مخلوق اور خدا کا محتاج، تو پادری صاحب بھی مخلوق خدا، اور خدا کا محتاج، پادری صاحب انسان، تو چمار بھی انسان، پادری صاحب کی دو آنکھیں، تو چمار کی بھی دو آنکھیں، پادری صاحب کی ایک ناک اور دو کان، تو اس کی بھی ایک ناک اور دو کان، ان کے بھی دو ہاتھ، تو اس کے بھی دو ہاتھ، چمار کو بھوک پیاس لگتی ہے، تو پادری صاحب بھی اس بلا میں مبتلا ہیں، چمار کو بول و براز کی حاجت ہے، تو پادری صاحب کو بھی یہ حاجت ستاتی ہے۔

غرض ذاتی باتوں میں کچھ فرق نہیں، دونوں یکساں ہیں، اگر فرق ہے، تو دولت، حشمت وغیرہ خارجی باتوں میں فرق ہے۔ اس اتحاد پر تو پادری صاحب کو یہ نخوت ہے کہ چمار کہہ دیجیے، تو تھامے نہ تھمیں، اور خدا تعالی کو بشر کے ساتھ کچھ اتحاد نہیں، بشر کو خدا کے ساتھ کچھ مناسبت نہیں، کچھ نسبت نہیں، اس کا وجود خانہ زاد، بشر کا وجود اسی سے مستعار، وہ خدا، یہ بندہ۔ اس پر خدا کو بشر کہے جائیں اور ہرگز نہ شرمائیں۔ افسوس کیسا ظلم صریح کرتے ہیں اور ہرگز نہیں ڈرتے۔ عاقلانِ فرنگ کو کیا ہو گیا۔

الوہیت اور انسانیت کا اجتماع محال:

اجتماع النقیضین اور اجتماع الضدین کا بطلان ایسا نہیں، جو کوئی نہ جانے، پھر اس

پر انسانیت اور الوہیت کے اجتماع کی تسلیم میں کچھ تأمل نہیں۔ یہ تو ایسا قصہ ہے، جیسا یوں کہیے کہ: ایک شئی نور بھی ہے، ظلمت بھی ہے، گرمی بھی ہے، سردی بھی ہے، موت بھی ہے، حیات بھی ہے، وجود بھی ہے، عدم بھی ہے؛ کیوں کہ انسانیت کو مخلوقیت اور احتیاج لازم۔ الوہیت کو استغناء اور خالقیت ضرور ہے۔ یہ دونوں ضدین مجتمع ہوں، تو کیوں کر ہوں؛ مگر اس بھی پر اپنی وہی ''مرغی کی ایک ٹانگ'' چلی جاتی ہے۔

اگر انصاف سے دیکھیے، تو شیطان، فرعون ونمرود وشداد وغیرہ کی نسبت کسی بے وقوف کو گمانِ الوہیت ہو، تو اتنا بعید از عقل نہیں، جتنا حضرت عیسی علیہ السلام اور دیگر انبیائے کرام، یا اولیائے عظام کی نسبت یہ خیال خام دور از عقل ہے؛ کیوں کہ حضرت عیسی علیہ السلام وغیرہ انبیاء، اولیاء تو برابر ساری عمر اپنی عبودیت اور عاجزی کا اقرار کرتے رہے اور سجدہ وغیرہ اعمال بندگی، جن سے انکار الوہیت مثل آفتاب نمایاں ہے، بجالاتے رہے۔

ہاں شیطان، فرعون، نمرود وغیرہ البتہ مدعیٔ الوہیت ہوے، اور کبھی وہ کام نہ کیا، جس سے بندگی کی بو بھی آئے، ان کو اگر کوئی نادان خدا سمجھے، تو خیر سمجھے۔ پر اس شخص کو خدا سمجھنا، جو خود مقر عبودیت ہو، طرفہ ماجرا ہے۔

حقیقی عیسائی کون؟:

حق یہ ہے کہ آج کل کے عیسائی حقیقت میں عیسائی نہیں، واقعی عیسائی اگر ہیں، تو محمدی ہیں۔ حضرت عیسی علیہ السلام کے جو عقیدے تھے، وہ محمدیوں کے عقیدے ہیں۔ وہ بھی خدا کو وحدہ لاشریک لہ کہتے رہے اور کبھی تثلیث کا دعویٰ نہ کیا، محمدی بھی یہی کہتے ہیں۔ حضرت عیسی علیہ السلام بھی اپنے آپ کو بندہ سمجھتے رہے؛ چناں چہ انجیل موجود ہے، محمدی بھی ان کو بندہ ہی سمجھتے ہیں۔

علاوہ بریں ان کی شان میں ہرگز کسی قسم کی گستاخی نہیں کرتے، نہ اس کی نسبت

ملعون ہونے کے خیال کو دل میں جگہ دیتے ہیں اور نہ احتمال عذاب ان کی نسبت ممکن الوقوع سمجھتے ہیں؛ بلکہ جو شخص حضرت عیسی علیہ السلام کی نسبت اس قسم کے عقیدے رکھے، اس کو دشمن دین وایمان اور بے دین و بے ایمان سمجھتے ہیں۔ اور حضرات نصرانیوں کا یہ حال باجود مخالفت اعتقاد یہ سب کچھ گستاخیاں بھی کیے جاتے ہیں اور اپنے آپ کو عیسائی کہے جاتے ہیں۔ کبھی یہ ترقی کہ خدا بنا دیا، کبھی یہ تنزل کہ عذاب میں پہونچا دیا۔ اب پادری صاحب انصاف فرمائیں کہ حضرت عیسیٰؑ کا اتباع ہم کرتے ہیں، یا وہ کرتے ہیں؟

پادری اسکاٹ کی بے عقلی کا پردہ فاش:

باقی رہا پادری صاحب کا یہ فرمانا کہ ''عیسائی عمل داری سے پہلے ہندوستان میں یہ لوٹ مار تھی کہ چوروں، قزاقوں سے بچنا ایک امر محال تھا اور جب سے عیسائی عمل داری آئی، جب سے یہ امن وامان ہے کہ سونا اچھالتے چلے جاؤ، کوئی شخص یہ نہیں پوچھتا کہ تم کون ہو''۔ اس ارشاد سے مجھ کو کمال درجہ حیرت ہے، اگر یہ بات اور کوئی صاحب فرماتے، تو فرماتے، پادری اسکاٹ صاحب کی معقول دانی پر استدلال کمال تعجب انگیز ہے۔ میں نے تو جب یہ سنا تھا کہ پادری صاحب معقول میں ماہر ہیں، صلۂ تصنیف رسالۂ منطق میں سرکار سے پانچ سو روپیہ انعام پا چکے ہیں، یوں منتظر تھا کہ دیکھیے کہ کیا کچھ ہوں گے؛ مگر انہوں نے یہ ایسی بات کہی کہ کوئی معقول داں ایسی بات نہ کہے۔ کیا پادری صاحب نے کتب منطق میں یہ نہیں دیکھا کہ استدلال انی نہ تمام ہوتا ہے، وضع تالی، منتج وضع مقدم نہیں ہوتی۔ آثار سے مؤثر پر استدلال نہیں ہوسکتا۔ پتھر کو گرم پائیں، تو یہ نہیں کہہ سکتے کہ آگ ہی سے گرم ہوا ہے۔ یہ بھی تو احتمال ہے کہ آفتاب سے گرم ہو گیا ہو۔

الغرض اثر کی جانب عموم کا احتمال ہوتا ہے؛ اس لیے اس کے وسیلے سے کسی خاص

مؤثر پر استدلال نہیں ہوسکتا۔ پھر پادری صاحب نے یہ کیوں کر کہہ دیا کہ یہ امن وامان عیسائی عمل داری کی برکت ہے، نہیں اس امن وامان کی برکت بجز پاس ملک وآرزوئے ترقی تجارت اور کچھ نہیں۔ مذہب سے اس بات کو کچھ علاقہ نہیں۔ ادھر ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ ہمارے خلفاء کے زمانے میں وہ امن وامان تھا، کہ کبھی نہ ہوا، نہ ہو، اگر یہی بات دلیل حقانیت مذہب ہے، تو دین محمدی بدرجہ اولیٰ حق ہوگا۔

عیسائیت کی شیش محل ملیا میٹ:

علاوہ بریں کچھ گناہ اس چوری اور قزاقی میں منحصر نہیں، جو یہ خیال ہو کہ بہ برکت دین عیسوی گناہوں سے نجات میسر آگئی۔ انجیل وتورات میں خنزیر کی حرمت موجود ہے۔ ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ اہل اسلام میں سے کوئی شخص سور کا گوشت نہیں کھاتا، جو اس جرم کا الزام اس کے سر آئے اور نصرانیوں میں شاید کوئی ایسا ہو، جو اس گناہ سے بچا ہوا ہو۔ تورات وانجیل میں شراب کی ممانعت موجود ہے اور ہم دعوی کرتے ہیں کہ اہل اسلام میں سے بہت کم اس بلا میں مبتلا ہوں گے اور نصرانیوں میں بہت کم آدمی اس بلا سے بچے ہوئے ہوں گے۔

علی ہذا القیاس سرکار کی عمل داری میں جس قدر زنا کی کثرت ہوئی ہے، اس قدر کبھی نہ ہوئی ہوگی، جس پر خاص لندن اور انگلستان کا حال تو پوچھیے ہی نہیں۔ کیا پادری صاحبوں کو لندن کے اخباروں کی اب تک خبر نہیں کہ وہ کیا لکھتے ہیں۔ ہر روز کئی سو بچے ولد الزنا پیدا ہوتے ہیں اور صبح کو راستوں پر پڑے ہوئے ملتے ہیں؛ یہ باتیں گناہ نہیں تو اور کیا ہے۔

علی ہذا القیاس اور بہت سی ایسی باتیں ہیں، جو از روئے تورات وانجیل ممنوع ہیں اور نصرانیوں میں مروج ہے۔ پھر کیوں کر کہہ دیجیے کہ بہ برکت دین عیسوی ہندوستان سے چوری، قزاقی اس لیے موقوف ہوگئی کہ اس دین کا اثر یہی ہے کہ

گناہوں سے آدمی محترز ہو جائے۔

پادری محی الدین اپنا آپا کھو بیٹھے:

اس تقریر میں وقت مقرر ختم ہو گیا؛ اس لیے وقت مولوی صاحب تو بیٹھے اور پادری محی الدین پشاوری کھڑے ہوے،، اول تو مولوی صاحب کی طرف مخاطب ہو کر یہ فرمایا کہ: آپ نے کل بھی بعض کلمات سخت کہے تھے ارو آج بھی آپ نے بعض کلمات سخت بیان کیے۔

مطلب یہ تھا کہ پہلے دن تو مولوی صاحب نے الحاقات انجیل کو وقت اثبات تحریف بول و براز سے تشبیہ دی اور اِس وقت پادری صاحب کو چمار سے تشبیہ دی گئی۔ اس پر غالباً مولوی صاحب نے اپنی جگہ پر بیٹھے ہوے یہ فرمایا کہ: یہ گستاخی نہیں، مثال فرضی میں گستاخی نہیں ہوتی۔ خیر یہ تو اوپر کی بات تھی کہ پادری صاحب نے شکایت گستاخی کے بعد؛ بلکہ اس گستاخی کی پاداش میں کسی قدر تیز وتند۔یعنی چیں بجبیں ہو کر اور یہ فرمایا کہ: ہم تمہارے سن وسال کا لحاظ کرتے ہیں، یہ فرما کر آپ جو حضرت عیسیٰؑ کی الوہیت پر اعتراض کرتے ہیں، دیکھیے تمہاری ہی کتاب ''روضۃ الانبیاء'' میں، جس کے مصنف کا نام ریاض الدین رومی ہے اور وہ کتاب اہل اسلام کے نزدیک معتبر ہے، حضرت عیسیٰؑ کی الوہیت کو خوب ثابت کیا ہے اور یہ کہہ کر ایک عبارت بے سروپا، نہ الفاظ صحیح، نہ اعراب ٹھیک، نہ کلمات میں ربط، بنام نہاد حدیث بیان کی۔

پادری محی الدین کی بے سروپا دلیل:

ہر چند وہ عبارت بجنسہ یاد نہیں رہی، پر اتنی بات یاد ہے کہ اول انہوں نے ''عبداللہ بن عمرٌ'' (''عینؔ'' کے پیش اور ''رؔ'' کی تنوین کے ساتھ کہہ کر واقفانِ عربیہ کو ہنسا ہنسا کر ایک عبارت پڑھی، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے

ایک شخص سے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، کہ آپ فرماتے تھے کہ: سوائے خدا کسی کو سجدہ نہ کرنا چاہیے؛ مگر حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔ لوگوں نے پوچھا کہ: اس کی کیا وجہ؟ آپ نے فرمایا: حضرت آدم میں شان الوہیت تھی، یہی وجہ تھی کہ فرشتوں نے ان کو سجدہ کیا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شان میں اللہ جل شانہ فرماتا ہے: "اِنَّ مَثَلَ عِیسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ آدَمَ"(۱)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ میں بھی شان الوہیت ہے؛ اس لیے ان کو سجدہ کرنا چاہیے اور اگر میں ان کے سامنے ہوتا، تو ان کو سجدہ کرتا۔

الوہیت وانسانیت کے اجتماع کی دلیلِ خام:

غرض اس قسم کے کلام بے سروپا بیان فرما کے یہ فرمایا کہ: ہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو انسان کامل اور معبود کامل دونوں کہتے ہیں اور ان میں دونوں وصف: انسانیت اور الوہیت پورے پورے ہمارے عقیدہ کے موافق موجود ہیں۔ اوصاف قدوسیت اور بے نیازی تو جہت الوہیت سے ان میں موجود تھی اور حاجت بول وبراز، بھوک وپیاس وغیرہ، منافیات قدوسیت وغیرہ جہت انسانیت سے ان میں موجود تھی۔ یہ اوصافاف منافیت قدوسیت ان میں جہت انسانیت سے تھے، نہ جہت الوہیت سے۔

اور حاضران جلسہ میں سے ایک صاحب کا یہ بھی بیان ہے کہ یہ بات انہیں پادری صاحب نے اس وقت فرمائی تھی، کہ حضرت عیسیٰ کی الوہیت کی ایسی مثال ہے، جیسے لوہے کو آگ میں گرم کر لیجیے، تو وہ بھی آگ ہی بن جاتا ہے؛ مگر راقم الحروف کو یہ یاد نہیں آتا کہ یہ بات کس نے کہی تھی؛ مگر ہر چہ بادا باد پادری صاحب تو زور مار کر بیٹھے اور مولوی محمد قاسم صاحب کھڑے ہوئے، اول یہ فرمایا کہ: وہ ریاض الدین رومی بھی ایسے ہی ہوں گے، جیسے آپ محی الدین پشاوری ہیں۔

(۱) سورہ آل عمران: ۵۹۔

آپ کی شکل وصورت بھی مسلمانوں کی سی ہے، نیچی ڈارھی، کرتا پہنے ہوئے ہیں، نام بھی مسلمانوں ہی کا سا ہے، آپ کو بھی کوئی دیکھے اور نام سنے، تو مسلمان ہی سمجھے، وہ بھی ایسے ہی ہوں گے۔ یہ بات پادری صاحب کو ایسی بھپی کہ دیکھنے والے ہی جانتے ہیں، اس وقت پادری صاحب کو خلاف توقع شرمانا ہی پڑا۔

حضرت نانوتویؒ اور پادری محی الدین پر جرح:

پھر مولوی صاحب نے یہ فرمایا کہ: اہل اسلام اس کتاب اور اس مصنف کو جانتے بھی نہیں۔ قرآن شریف کی آیت، یا صحاح ستہ کی روایت ہوتی، تو البتہ موقع بھی تھا، یہ کتنی ناانصافی ہے کہ اپنی طرف سے ایک روایت بنالی اور اس پر اہل اسلام سے مقابلہ کو آموجود ہوئے۔ اگر یہی انداز ہے کہ کسی کے بزرگوں کے نام کوئی عبارت یا روایت لگالی اور مقابلہ کو آپہونچے، تو پھر اہل اسلام کو بھی بہت گنجائش ہے۔ یہاں آکر اس روایت کو پادری صاحب رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کر کے حضرت عیسی علیہ السلام کی الوہیت ثابت کرتے ہیں، تو ہم بدستاویز ''انجیلِ بربناہ'' رسول اللہ ﷺ کی رسالت ثابت کریں گے۔ انجیلِ بربناہ میں صاف رسول اللہ ﷺ کی بشارت موجود ہے۔

غرض اگر روایت مشار الیہ سے حضرت عیسی علیہ السلام کی الوہیت ثابت ہوتی ہے، تو انجیلِ بربناہ کی آیت بشارت سے رسول اللہ ﷺ کی رسالت ثابت ہوتی ہے۔ پھر کیا انصاف ہے کہ ہم پر تو ایسی روایات سے الزام لگانے کو تیار ہیں اور آپ انجیل بربناہ کی روایت کو نہ مانیں۔

علاوہ بریں یہ روایت ہی خود اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ روایت جعلی ہے، نہ الفاظ صحیح ہیں، نہ اور کوئی بات ٹھکانے کی ہے۔ اہل زبان کا یہ کام نہیں کہ ایسی مہمل عبارت ناکارا منھ سے نکالیں، اس کے موضوع ہونے میں کچھ شک وشبہ نہیں، ہم کو

الزام دینا منظور ہے، تو ہماری کتب معتبرہ سے دینی چاہیے۔ قرآن شریف کی آیت لائیے، یا صحاح ستہ وغیرہ کتب معتبرہ مشہورہ احادیث کی روایت دکھلائیے۔ ہماری تمام کتب معتبرہ مشہورہ میں سجدۂ غیر کی ممانعت اور حضر عیسی علیہ السلام کے بندہ ہونے کا دعویٰ ایسا کھلا کھلا بکثرت لکھا ہے کہ سب جانتے ہیں۔ کوئی مذہب ایسا نہیں کہ اہل اسلام کے اس اعتقاد اور ان کے تمام کتب کی شہادت اس اعتقاد پر نہ جانتا ہو۔

غرض قرآن شریف اور تمام کتب احادیث جو ماخذ اعتقاد اہل اسلام ہیں، حضرت عیسیٰ کے بندہ ہونے اور خدا نہ ہونے سے مالا مال ہیں۔ پھر کس منھ سے پادری صاحب نے اس روایت کو پیش کیا، اپنے گھر کی خبر نہیں کہ انجیل بر بناہ کیا کہتی ہے۔ باقی یہ جو پادری صاحب نے ارشاد فرمایا کہ: حضرت عیسیٰ مجمع الجہتین ہیں: انسان کامل بھی ہیں اور معبود کامل بھی۔ جہت انسانیت سے اکل وشرب، مرض، موت، بول و براز ان کو لاحق تھے اور بے نیازی وقدوسیت وغیرہ جہت الوہیت سے ان کو حاصل تھی۔ سو یہ ایک ایسی مہمل بات ہے کہ کوئی عاقل اس کو قبول نہیں کر سکتا۔ جیسے باپ، بیٹا اور بیٹا، باپ نہیں ہوسکتا، ایسے خدا، بندہ اور بندہ، خدا، عابد، معبود، اور معبود، عابد؛ نہیں ہوسکتا، وہ محال ہے، تو یہ بھی محال ہے۔

حضرت عیسی علیہ السلام کا خدا ہونا عقل ونقل کے خلاف:

اگر بفرض محال یہ احتمال تسلیم بھی کیا جائے، خدائی اور بندگی دونوں حضرت عیسی علیہ السلام میں مجتمع مان لیا جاویں، تو بایں لحاظ کہ اس صورت میں اِلہ اور انسان ایک ذاتِ واحد عیسوی ہوگی اور یہ دونوں حسب زعم نصاریٰ ان میں حقیقی ہوں گے، تو انسانیت کے عیوب اور نقصانات سب کے سب جہت الوہیت کو لاحق ہوں گے، اور ایسی صورت ہو جائے گی، جیسے کرتا انگرکھا وغیرہ، کرتا انگرکھا وغیرہ بھی ہوتا ہے اور کپڑا بھی ہوتا ہے۔ انگرکھا وغیرہ اگر ناپاک ہو جائے، تو کپڑا بھی ناپاک ہو جاتا ہے، اور

کپڑا وغیرہ اگر ناپاک ہو جائے، تو انگرکھا وغیرہ بھی ناپاک ہو جاتا ہے۔غرض اگر ایک ناپاک ہو جاتا ہے، تو دوسرا ساتھی بھی ناپاک ہو جاتا ہے، وہ ہرگز پاک نہیں رہ سکتا۔

اگر اسی طرح بالفرض والتقدیر الوہیت اور انسانیت ذات عیسوی میں مجتمع ہو جائیں، تو عیوب انسانیت خواہ مخواہ الوہیت کو لاحق ہوں گے، وہ ان عیوب سے منزہ نہیں رہ سکتے۔

یہاں تک تو ان باتوں کے جواب ہیں، جن کو ہم یقیناً کہہ سکتے ہیں کہ پادری محی الدین نے بیان کی تھیں۔ رہی وہ بات جس میں ہم کو شک ہے کہ قائل اس کا کون تھا۔ یعنی یہ بات کہ حضرت عیسی کی الوہیت کی صورت ایسی ہے، جیسے لوہے کو آگ میں تھوڑی دیر ڈالے رکھتے ہیں، تو وہ بھی آگ بن جاتا ہے، اس بات کے جواب میں، خواہ پادری محی الدین کی کہی ہوئی ہو، خواہ کسی اور کی، غالباً مولوی صاحب نے یہ فرمایا تھا کہ: اس مثال سے صاف یہ بات عیاں ہے کہ خدا ایک ہے، متعدد نہیں اور حضرت عیسی بندہ ہیں، خدا نہیں۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ لوہا دیکھنے میں ظاہر پرستوں کو ہم رنگ آتش نظر آتا ہے، پر حقیقت میں اس وقت بھی لوہا، لوہا ہی رہتا ہے، آگ نہیں ہو جاتا۔ فقط پرتوِ آتش سے اس کا رنگ بدل جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آگ سے علیٰحدہ کر لیجیے، تو پھر لوہا اپنی حالت اصلی پر آ جاتا ہے۔ اگر واقعی آگ ہو جایا کرتا، تو اور انگاروں کی طرح ساتھ رہتا، یا علیٰحدہ ہوتا، تو دونوں حالتوں میں یکساں رہتا۔

اور اسی اعتراض کے وقت بمجرد سننے کے مولوی صاحب نے کرسی سے کھڑے ہو کر یہ کہہ دیا تھا کہ دیکھیے! پادری صاحب اس وقت تثلیث سے انکار کرتے ہیں اور میں جانتا ہوں کہ وجہ اس کی یہی تھی، جو اوپر مذکور ہوئی۔

اس کے بعد مولوی صاحب بیٹھے، پر کسی پادری صاحب کو حوصلہ نہ ہوا کہ ان

اعتراضوں کا جواب دیتا، یا ان جوابوں پر نقض کرتا، جو مولوی صاحب سے سنے تھے۔ ہاں اتنا ہوا کہ پادری نولس صاحب کھڑے ہوے اور دیر تک چلا چلا کے اپنے مذہب کے فضائل بے دلیل بیان کرتے رہے، یا وہی پہلے مضمون اعادہ کرتے رہے؛ بلکہ الفاظ کا پھیر تھا؛ ورنہ اسی تقریر اول کا اعادہ تھا، کوئی نئی بات بھی نہ کہی، چہ جائے کہ اعتراضوں کا جواب دیتے۔

پنڈت دیانند اور شیطان کے وجود کا انکار:

غرض پھر کوئی ایسی بات کسی نے نہ کہی، جو سننے سنانے کے قابل ہو، بجز سمع خراشی اور کچھ نہ تھا۔ البتہ قابل بیان دو باتیں اور تھیں، جن کا وقت اور موقع یاد نہیں رہا، فقط وہ باتیں یاد رہ گئی ہیں: ایک تو یہ کہ کسی موقع میں پادریوں کی طرف سے صبح کے جلسہ میں یا تیسرے پہر کے جلسہ میں کسی نصرانی نے اتفاقاً شیطان کا ذکر کیا تھا اور غالباً غرض یہ ہوگی کہ گناہ کا باعث شیطان ہے۔ اس پر پنڈت صاحب نے یہ فرمایا تھا کہ دنیا کے بادشاہ بھی اتنا تو انتظام کر لیتے ہیں کہ اگر ان کے ملک میں کوئی لٹیرا، یا قزاق کھڑا ہو جاتا ہے، تو اس کو گرفتار کرا لیتے ہیں اور قتل کرا دیتے ہیں، اور یہ تو کوئی بادشاہ بھی نہیں کرتا کہ اپنے ملک میں ڈاکو اور قزاق اپنی طرف سے چھوڑ دے۔ کیا خدا کی طرف یہ گمان ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے ملک میں دین کا قزاق چھوڑ دے، اور اس کو اسی کام پر مقرر کر دے؟ اس کو تو یہ مناسب تھا کہ اگر بالفرض والتقدیر ایسا ہوتا بھی، تو اس کو گرفتار کرا لیتا، نہ یہ کہ الٹا اپنی طرف سے اس کام کے لیے اس کو مقرر کرتا۔

شیطان برائی کا خالق: پادری نولس کا عقیدہ:

اس کے بعد پادری نولس صاحب نے یہ فرمایا تھا کہ اگر پنڈت جی شیطان کا انکار کرتے ہیں، تو یوں کہو کہ یہ سب برائی خدا تعالیٰ کرتا ہے؛ کیوں کہ اس صورت میں کم سے کم اتنا تو کہنا پڑے گا کہ ایسے برے آدمی خدا نے پیدا کیے، جن سے برے

کام ظہور میں آئے۔ غرض شیطان کو نہ مانا جائے، اور برائی کو آدمیوں کے حق میں ذاتی کہی جائے، تو یہ برائی دور تک پہونچے گی؛ کیوں کہ اس وقت برائی کا خالق خدا کو کہنا پڑے گا۔

پنڈت دیانند کا سوال: جنت کہاں ہے؟:

دوسرے ایک اور بات بھی ایسی ہے کہ اس کا موقع یاد نہ رہا، جس کی وجہ سے اس کے لکھنے کا اتفاق نہ ہوا، اور حقیقت میں لکھنے کے قابل ہے۔ وہ یہ ہے کہ پادریوں میں سے کسی نے کسی بات کے بیان میں کہیں جنت کا ذکر کر دیا تھا۔ اس پر پنڈت صاحب نے یہ فرمایا تھا: کوئی بتلائے تو جنت کہاں ہے؟

اس پر مولوی محمد قاسم صاحب نے اپنی جائے پر بیٹھے ہوئے یہ فرمایا کہ: پنڈت صاحب! اگر ہم کو وقت تقریر دیا جائے گا، تو ان شاء اللہ! ہم آپ کو بتلا دیں گے؛ مگر اس کے بعد پھر وقت ہی نہ ملا؛ بلکہ پادری نولس صاحب کے خاموش ہونے کے بعد جو مولوی محمد قاسم صاحب کھڑے ہوئے، تو پادریوں نے ایسی ہٹ دھرمی کی، جس کا کوئی ٹھکانا نہیں۔

پادری حضرات میدان چھوڑ کر بھاگے:

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ہنوز چار بجنے میں کسی قدر دیر تھی اور بایں وجہ کہ شروع جلسہ میں آدھ گھنٹہ اس تکرار میں ضائع ہو گیا تھا کہ اس وقت کون سے سوال پر بحث ہونی چاہیے، یہ ٹھہر گئی تھی کہ آدھ گھنٹہ چار بجے کے بعد بڑھا دیا جائے اور اہل اسلام نے بھی یہ کہہ لیا تھا کہ خیر آج ہم ساڑھے چار بجے ہی نماز پڑھ لیں گے۔ ابھی آدھ گھنٹہ کی اور گنجائش تھی؛ مگر اس پر بھی پادری لوگ کھڑے ہو گئے اور یہ کہا: جلسہ کا وقت ختم ہو گیا۔ مولوی صاحب اور موتی میاں صاحب اور نیز اہل اسلام نے ہر چند اصرار کیا کہ زیادہ نہیں، دو چار منٹ جو چار بجنے میں باقی ہیں، انہیں میں ہم کچھ کہہ

لیں گے؛ مگر پادری صاحبوں نے ایک نہ سنی۔

اہل اسلام کا غلبہ یوں تقریراتِ گزشتہ سے ثابت ہی تھا، پر یہ انکار واصرار ان کے غلبہ اور عیسائیوں کی شکست کے لیے ایسا ہوگیا، جیسا غنیم کا میدان سے بھاگ جانا ہوا کرتا ہے۔ پھر اس پر طرہ یہ کہ اس سراسیمگی اور پریشانی میں جو رنج پنہانی کے باعث پادریوں کو لاحق تھی، پادری لوگ اپنی بعض کتابیں بھی وہیں چھوڑ گئے، ان کے اٹھانے کی بھی ہوش نہ رہی۔

القصہ اس وقت پادریوں کو بجز اس بات کے اور کوئی بات اپنی دامن گزاری کے لیے سمجھ میں نہ آئی اور پادریوں کا یہ کھڑا ہوجانا اس وقت ہندوؤں کے لیے غالبًا غنیمت معلوم ہوا، وہ بھی ان کے ساتھ ہولیے۔ پر یہ بات عام وخاص کی نگاہوں میں اہل اسلام کے غلبہ پر اور بھی دلیل کامل ہوگئی؛ مگر جب مولوی صاحب نے یہ دیکھا کہ حضرات عیسائی کسی راہ نہیں مانتے، تو مولوی صاحب نے یہ فرمایا کہ: اچھا آپ تو سنیے! ہم اپنی طرف سے بیان کیے دیتے ہیں؛ مگر پادری صاحبوں نے بغرض برہمی جلسہ شور کرنا شروع کردیا۔ ایک طرف تو ایک صاحب انجیل لے کر کھڑے ہوگئے اور ایک طرف کچھ انکار اور اقرار کا شور تھا؛ اس لیے اس وقت تو مولوی صاحب بغرض بایں خیال کہ ناحق نماز عصر میں دیر ہوتی ہے، نماز کے لیے تشریف لے گئے اور پھر نماز سے فارغ ہوتے ہی اسی موقع پر پہونچ کر اس چوکی پر، جس پر گفتگو کرنے والے کھڑا ہوا کرتے تھے، کھڑے ہوے۔ دیکھتے ہی اطراف وجوانب سے لوگ آپہونچے۔

حضرت نانوتویؒ اور اتمام حجت:

مولوی صاحب نے اول یہ فرمایا کہ: ہم نے ہر چند چاہا کہ پادری صاحب ہماری ایک دو بات سن لیں، پر چوں کہ اہل اسلام سے عہدہ برآئی کی امید نظر نہ آئی، تو انجام کار یہ کام کیا اور بعد اس کے اس قسم کی باتیں فرمائیں کہ اہل جلسہ کو یہ بات بخوبی

معلوم ہوگئی کہ اہل اسلام کے اعتراضوں کا کسی نے جواب نہ دیا اور اہل اسلام نے سب کے اعتراضوں کا جواب ایسا دیا کہ پھر کسی کو جواب نہ آیا۔ پھر کچھ ایسا کہا کہ اب بروئے انصاف رسول اللہ ﷺ کی رسالت ثابت ہوگئی اور کسی شخص کو بروئے انصاف کوئی اعتراض باقی نہیں رہا۔

اور اسی ضمن میں پادری صاحب کی اس تقریر کا جواب دیا، جو انہوں نے اعادہ کرکے بیان کی تھی؛ مگر چوں کہ ان جوابوں کے مضمون بھی قریب قریب انہیں جوابوں کے تھے، جو مولوی صاحب اول دے چکے تھے؛ اس لیے ان کے لکھنے میں بجز تطویل اور کچھ چنداں حاصل نہیں؛ مگر ہاں پادری لوگ گھبراہٹ میں جو دو کتابیں چھوڑ کر چلے گئے تھے، جس وقت مولوی صاحب نے بعد نماز پھر کچھ بیان کرنا شروع کیا، تو اس وقت پادری جان ٹامس گھبرائے ہوئے آئے اور یہ کہا کہ ہماری دو کتابیں رہ گئیں۔ حاضرانِ جلسہ نے کہا: پادری صاحب! ایسے کیوں گھبرا گئے تھے کہ کتابیں بھی چھوڑ گئے۔

اہل اسلام کی فتح:

الغرض مولوی صاحب بعد انفراغ وہاں سے چلے اور لوگوں کا یہ حال تھا کہ کوئی واہ واہ کہتا تھا، کوئی سلام کرتا تھا۔ راقم الحروف نے دیکھا کہ اس وقت بعض ہندوؤں نے یہ کہا کہ: واہ مولوی صاحب، اور بعض ہندو آتے تھے اور مولوی صاحب کو سلام کرتے تھے۔ بالجملہ اہل اسلام کا غلبہ اس وقت سب کے نزدیک آشکارا تھا۔ اس کے بعد دیکھا کہ پادریوں نے چلنے کی تیاری کردی اور وعدۂ وعظ جو چار بجے پر ٹھہرا تھا، وفا نہ کیا۔ ادھر پنڈت صاحب اور منشی اندرمن صاحب چاندا پور کے لیے چل دیے؛ اس لیے بہ مجبوری اہل اسلام نے بھی قصد روانگی کیا؛ کیوں کہ ٹھہرنے کی ضرورت نہ رہی۔ ادھر جنگل میں ہر قسم کی تکلیف تھی، بارش، اولوں وغیرہ کا اندیشہ تھا، پھر کس لیے وہاں رہ کر تکلیف اٹھاتے۔ کچھ دن رہے، وہاں سے روانہ ہوئے اور حسب خواہش مولوی

محمد طاہر صاحب ان کے مکان پر فروکش ہوے؛ مگر وہ ان کی مہمان نوازی اور دل جوئی اس وقت آنکھوں میں پھرتی ہے۔ صبح کو مولوی محمد علی صاحب اور مولوی محمد قاسم صاحب پاس پاس بیٹھے ہوے تھے، جو ایک صاحب تشریف لائے، گو نام ان کا راقم کو معلوم نہیں، پر اہل اسلام میں سے تھے اور کیفیت ملاقات سے یوں معلوم ہوا کہ مولوی محمد علی صاحب سے کسی قسم کا سابقہ اور رابطہ تھا۔ چوں کہ چاندا پور کے میلے ہی کا افسانہ ہو رہا تھا، تو انھوں نے بھی فرمایا کہ: منصف صاحب فرماتے تھے: اول میں بھی اس وقت پہونچ گیا تھا، جس وقت مولوی محمد قاسم صاحب نبوت کے متعلق تقریر کر رہے تھے، وہ تقریر مجھ کو نہایت ہی درجہ پسند آئی، اس کے بعد مولوی صاحب نے پادری صاحب کو تو ایسا ذلیل کیا کہ غیرت ہو، تو منھ نہ دکھائیں اور مجھ کو بڑا تعجب آتا ہے کہ مولوی صاحب کی اور میری ملاقات کبھی نہیں ہوئی، پھر نہ معلوم انھوں نے کس طرح مجھ کو پہچان لیا، جو بار بار میری طرف اشارہ کر کے یوں کہتے تھے کہ منصف صاحب ہی ہمارے حکم رہے۔

اور شاید اسی روز پادری اسکاٹ صاحب مولوی عبدالمجید صاحب کو بازار میں مل گئے، مولوی صاحب کا بیان ہے کہ میں نے پادری صاحب سے کہا: آپ نے وقت تقریر کوئی ایسی بات نہ کہی، جو معقول ہوتی۔ پادری صاحب نے فرمایا: مجھ کو موقع نہ ملا، اس کے بعد جناب مولوی محمد قاسم صاحب کی نسبت تو یہ فرمایا کہ مولوی صاحب، مولوی نہیں، صوفی مولوی ہیں اور اس قسم کا علم اب اہل اسلام میں نہیں رہا اور پھر یہ کہا کہ کوئی شخص الہیات میں اہل اسلام کا ہم پلہ نہیں۔

اسی روز یہ بھی ہوا کہ غالباً مولوی محمد قاسم صاحب نے مولوی محمد علی صاحب سے عرض کیا: کیا کہیے! منشی اندرمن کی اور آپ کی گفتگو نہ ہوئی، وہ کچھ بولے ہی نہیں، یہ ارمان دل کا دل ہی میں رہا۔ اگر آپ فرمائیں، تو مولوی محمد طاہر صاحب کی معرفت

ان کو ایک خط اس مضمون کا لکھا جائے۔ مولوی محمد علی صاحب نے فرمایا: میں نے تو ایک بڑے مسئلہ میں۔ یعنی قِدم عالم میں کچھ مختصر گفتگو شروع کی بھی تھی اور یہ مسئلہ ایک بڑا مسئلہ من جملہ عقائد لالہ اندر من ہے۔ اسی پر بنائے تناسخ ہے، جو ان کے نزدیک من جملہ عقائد ضروریہ ہے؛ مگر وہ ایسے خاموش بیٹھے رہے، کہ کھڑے بھی نہ ہوے اور پنڈت دیانند کی تقریر سے بھی بطلان قِدم عالم اور بطلانِ اقوال لالہ اندر من مندرجہ کتاب ''تحفۃ الاسلام'' وغیرہ ظاہر تھا۔ پس اب ان سے مباحثہ کی کیا ضرورت ہے اور اگر آپ کو منظور ہے، تو میں شاہ جہاں پور میں ٹھہرا ہوا ہوں، آخر لالہ اندر من بھی اسی راہ سے مراد آباد کو جائیں گے، آپ ان کو لکھ بھیجئے۔ چناں چہ مولوی محمد طاہر صاحب نے ان کو لکھا کہ آپ براہِ کرم بہ ہمراہی پنڈت دیانند صاحب تشریف لاکر قبول دعوت سے مرہونِ منت فرمائیں۔ اس تقریب میں آپ کے اور مولوی محمد علی صاحب کے مباحثہ کا جلسہ ہو جائے گا؛ مگر انہوں نے شاہ جہاں پور آنے سے انکار کر دیا اور چوں کہ صاف انکار اپنی توہین تھی، تو یہ لکھا کہ آپ ہی مولوی صاحب کو لے کر یہاں تشریف لے آئیں۔ اس پر مولوی محمد طاہر صاحب نے باشارۂ مولوی محمد قاسم صاحب وحسب صلاح مولوی محمد علی صاحب پھر مکرر لکھا کہ ''جنگل میں مور ناچا، کس نے دیکھا''، وہاں کا مجمع برخاست ہو گیا، اب وہاں کون ہے، جو مباحثہ کا لطف اٹھائے گا۔ آپ فرماتے تو تھے ہی کہ ایک دو روز میں شاہ جہاں پور ہو کر مراد آباد آجاؤں گا۔ اگر اثنائے راہ میں یہ جلسہ اور ہو جائے، تو زہے اولیٰ، یہاں بوجہ شہریت مجمع بھی کثیر ہو جائے گا؛ مگر انہوں نے پھر بھی انکار ہی کیا اور یہ کہا کہ میں آپ کے مکان پر نہیں آتا، ہاں اگر منشی گنگا پرشاد ہوتے، جن کی تبدیلی عہدۂ ڈپٹی کلکٹری پر مقام شاہ جہاں پور ہو گئی ہے، تو ان کے مکان پر آسکتا تھا۔ خیر یہاں تو نہیں، مراد آباد میں میری اور مولوی محمد علی صاحب کی گفتگو ہو جائے گی۔

اس انکار مکرر کو سن کر دیو بند، میرٹھ، دلی، خورجہ وغیرہ مقامات کے رہنے والے صاحب جو شوق مباحثہ میں آئے تھے اور اس چھیڑ چھاڑ کو سن کر ٹھہر گئے تھے؛ چلد یے، مگر ہاں اس اثنا میں بعض صاحبوں نے مولوی محمد قاسم صاحب سے یہ کہا کہ آپ نے پنڈت صاحب کے مقابلہ میں جب انہوں نے بہشت کی نسبت فرمایا تھا کہ کوئی شخص ہمیں بتلائے تو سہی ''بہشت'' کہاں ہے؟ یہ فرمایا تھا کہ اگر ہم کو وقت ملے گا، تو ہم آپ کو بتلا دیں گے۔ سو اس وقت تو بوجہ تنگیٔ وقت اس کے بیان کا اتفاق نہ ہوا، اور اس وجہ سے دل میں ارمان رہ گئے، اب یہ عرض ہے کہ اگر آپ بیان فرماتے، تو کیا فرماتے؟

حضرت نانوتویؒ اور وجودِ جنت پر محقق تقریر:

اس وقت مولوی صاحب نے فرمایا: لیجیے اب سن لیجیے! دنیا میں ہم دیکھتے ہیں: لذتیں خالی تکلیف سے نہیں اور تکلیفیں خالی راحتوں سے نہیں، منافع خالی مضرتوں سے نہیں، اور مضرتیں خالی منفعتوں سے نہیں، کھانا پانی ہر چند سامان راحت اور نفع کی چیز ہے؛ مگر اس کے ساتھ پاخانہ پیشاب کی خرابی اور امراض کے نقصان ایسے کچھ ہیں کہ کیا کہیے۔ اور کڑوی دوائیں اور فصد اور قطع و برید جراح اگرچہ سر دست سرمایۂ تکلیف ہے؛ مگر انجام کار کیسی کیسی راحتیں ان کے ساتھ لگی ہوئی ہیں۔ اس بات کے دیکھنے سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیزیں بحیثیت آرام و تکلیف، و نفع و ضرر ایسے ہیں، جیسے باعتبار گرمی و سردی، و خشکی و تری مزاج مرکبات عنصری معلوم ہوتا ہے۔ یعنی جیسے وہاں اشیائے متضادہ کے اجتماع سے ایک مزاج مرکب حاصل ہو جاتا ہے، ایسے ہی یہاں بھی سمجھیے۔

مرکبات عنصری کی ترکیب میں اگر معلوم ہوتی ہے کہ گرمی سردی، خشکی تری ساری باتیں مرکبات مذکورہ میں معلوم ہوتی ہیں؛ ورنہ ترکیب کرتے ہوئے کس نے

خدا تعالیٰ کو دیکھا ہے۔ جب ہم اپنے بدن میں دیکھتے ہیں کہ قلیل و کثیر یبوست ہے، تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ہمارے بدن میں جزو خاکی ہے؛ ورنہ اس یبوست کی اور کیا صورت تھی؛ کیوں کہ یبوست خاصہ خاک ہے، سوا اس کے اور کسی چیز میں یہ بات نہیں، ہو نہ ہو، جزو خاکی کی یہ تاثیر ہے کہ ہمارے بدن میں یبوست پائی جاتی ہے۔

بہشت آں جا کہ آزارے نہ باشد:

اسی طرح رطوبت بھی کسی قدر نہ کسی قدر اپنے بدن میں موجود ہے اور وہ خاصۂ آب ہے؛ اس لیے یہ بات واجب التسلیم ہے کہ ہمارے بدن میں لاریب جزوے آبی ہوگا۔ علیٰ ہذا القیاس ہوا اور آگ کا سراغ نکل آتا ہے؛ مگر یہ بھی ظاہر ہے کہ جیسے یبوست اور رطوبت باہم ضد یک دیگر ہیں، ایسے ہی معدنِ حرارت کچھ اور ہوگا، اور مخزنِ تکلیف کچھ اور ہوگا۔ جیسے مرکبات عنصریہ باعتبار کمی بیشی رطوبت و یبوست، حرارت و برودت مختلف ہیں اور اس کی یہ وجہ ہے کہ کسی میں خاک زیادہ ہے، تو کسی میں پانی زیادہ ہے۔ اسی طرح باعتبار راحت و تکلیف کے مرکبات کو خیال فرمائیے کہ ان کی اصول بھی اسی طرح جدی جدی ہوں گی، انہیں میں سے لے لو، اگر سامان ہائے آرام و تکلیف کو بنایا ہوگا اور ان اصول میں ایک ایک بات کے سوا اسی طرح اور کچھ نہ ہوگا۔ جیسے آب و خاک اصول رطوبت و یبوست میں ایک ایک چیز ہی ہے، دوسری چیز نہیں۔ اس صورت میں ایک ایسا مقام اور طبقہ ماننا پڑے گا کہ جہاں فقط آرام ہو، تکلیف اصلاً نہ ہو، ہم اسی کو ''بہشت'' کہتے ہیں۔ ع:

بہشت آں جا کہ آزارے نہ باشد

دوزخ آں جا کہ راحت نہ باشد:

اور ایک ایسا مقام اور طبقہ ہوگا کہ جہاں فقط تکلیف ہی تکلیف ہوگی، آرام کا نام وہاں نہ ہوگا، ہم اسی کو ''دوزخ'' کہتے ہیں۔

بالجملہ جیسے رطوبت یبوست وغیرہ کیفیات جسمانی کے لیے بھی جدی جدی اصل

اور جدا جدا طبقہ ماننا لازم ہے، اسی طرح آرام وتکلیف کے لیے بھی جدی جدی اصل اور جدا جدا طبقہ ماننا لازم ہے۔ رہی یہ بات کہ وہ کہاں ہیں اور کدھر ہیں؟ یہ سوال از روئے عقل قابل استماع نہیں، موجود ہونے کے لیے یہ لازم نہیں کہ ہم کو معلوم ہی ہوا کرے۔ خود اس زمین میں ہزار ہا مقامات اور اشیاء ایسی ہیں کہ ہم کو معلوم نہیں، اگر زمین اور آسمان کے اندر ہو، اور ہم کو معلوم نہ ہو، تو کیا محال ہے اور ہو، اور زمین وآسمان کے باہر ہو، تو کیا ممتنع ہے۔

شیاطین اور فرشتوں کے وجود کا اثبات:

اور اسی تقریر کے ساتھ وجہ ثبوت شیطان وملائکہ بھی مولوی صاحب بیان کر گئے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ: آدمی کی رغبت اور توجہ ہر دم فقط نیکی یا بدی ہی طرف نہیں رہتی، کبھی آدمی کا دل نیکی کی طرف راغب ہے، تو کبھی بدی کی طرف مائل ہے۔ اس اختلاف رغبت ومیلان سے صاف ظاہر ہے کہ ترکیب روحانی بے شک ایسے دو جزوں سے ہوئی ہے، جو باہم متضاد ہیں؛ ورنہ ایک شئی سے ایسی دو مختلف کیفیتوں کا پیدا ہونا ایسا ہی محال ہے، جیسے ایک عنصر خاکی، یا آبی سے، مثلاً یبوست رطوبت دونوں کا پیدا ہونا محال ہے۔ جیسے وہاں اس کی ضرورت ہے، اگر یہ دونوں کیفیتیں کہیں مجتمع ہو جائیں، تو دو عنصر مذکور ضرور ہی مجتمع ہوں گے، ایسے ہی یہاں بھی خیال فرما لیجیے۔ پھر جیسے وہاں ہر ایک کے لیے جدا طبقہ ہے، ایسے یہاں بھی ہر ایک کے لیے ایک جدا ہی طبقہ ہوگا۔ جیسے وہاں ہر طبقہ میں ایک خاصیت وکیفیت ہے، ایسے ہی یہاں بھی ہوگا؛ اس لیے یہ بات خواہ مخواہ ماننی پڑے گی کہ ایک گروہ تو مخلوقات میں ایسی ہوگی کہ ان کی خاصیت اصلی بھلائی اور نیکی کی طرف رغبت ہوگی، یوں جیسے بوجہ برف پانی میں یبوست آجاتی ہے، ان میں اگر بوجہ خارجی برائی کی طرف رغبت آجائے، تو آجائے۔

اور ایک گروہ مخلوقات میں ایسی ہوگی کہ ان کی خاصیت اصلیہ برائی کی طرف رغبت ہو، یوں جیسے خاک میں بوجہ آگ رطوبت آجاتی ہے، اگر بوجہ خارجی بھلائی کی

طرف رغبت ہو جائے، تو ہو جائے۔

پہلے گروہ کو ہم ''ملائکہ'' کہتے ہیں، اور دوسرے گروہ کو ہم ''شیاطین'' کہتے ہیں۔ جیسے مزاج مرکبات عنصریہ میں امداد خارجی سے فرق آجاتا ہے، اور ایک خلط کا غلبہ ہو جاتا ہے؛ چناں چہ اسی وجہ سے گرم دواؤں اور غذاؤں کے کھانے سے گرمی اور سرد غذاؤں اور دواؤں کے کھانے سے سردی؛ پیدا ہو جاتی ہے اور مزاج اصلی میں تغیر آجاتا ہے۔ ایسے ہی یہاں بھی بوجہ امتداد خارجی رغبت قلبی میں تغیر آئے گا، یوں نہ آئے گا۔

بالجملہ ملائکہ اور شیاطین کا وجود یقینی ہے۔ یہاں تک کہ اس وقت مولوی صاحب نے بیان کیا، اس کے بعد مولوی صاحب کی اور تقریریں اس باب میں معلوم ہوئیں، ان کو بھی درج اوراق کیا جاتا ہے؛ اس لیے یہ گزارش ہے کہ اس تقریر سے تو فقط ثبوت شیاطین و ملائکہ اور ثبوت جنت و دوزخ معلوم ہوا، اور بعد معلوم ہو جانے پھر یہ کہنا کہ اگر شیاطین کو مانیے، تو یہ معنی ہوں گے کہ گویا خداوند عالم نے اپنے ملک میں ایک قزاق اپنی طرف سے چھوڑ دیا، ایسا ہی ہوگا کہ گویا پانی، آگ، ہوا وغیرہ کے نقصانوں کو خیال کر کے کوئی شخص باوجود دلالت رطوبت و گرمی وغیرہ یہ کہے جائے کہ اگر جسم انسانی میں آگ ہو، تو یوں کہو: خدا نے ایسا کیا کہ کوئی شخص اپنے آپ چھپر بنائے اور پھر آپ ہی اس میں آگ بھی لگا دے۔ نہ یہ قرین عقل ہے، نہ قرین قیاس۔

دنیا کا حسن اچھائی اور برائی سے ارتباط میں ہے:

الحاصل جیسے باوجود دلالت آثار وجود عناصر میں بوجہ مذکور تامل کرنا عاقل کا کام نہیں۔ ایسے بوجہ دلالت آثار مشار الیہ وجود شیاطین میں بوجہ مذکور متامل ہونا اہل عقل سے دور ہے۔ جیسے ترکیب انسانی عناصر متضادہ سے بدلالت فطرت سلیمہ اس لیے ہے کہ اس ترکیب سے ایک عمدہ نتیجہ پیدا ہوا، جس کو مزاج مرکب کہتے ہیں اور جس کے وسیلہ سے ہزاروں آثار عجیبہ نمایاں ہوے، جو حیوانات میں مشہود ہوتی ہیں۔ ایسی ہی ترکیب عالم میں شیاطین و ملائکہ وغیرہ کا ہونا بے شک ایک عمدہ نتیجہ پیدا کرے گا۔ کیا

کہیے اور کیوں نہ ہو، ہر حسن و جمال میں بھلی بری دونوں قسم کی چیزیں ہوتی ہیں، مکان عمدہ وہی ہے، جس میں پاخانہ بھی ہو، یہی نہیں کہ سوائے پاخانہ اور سب چیزیں ہوا کریں اور پاخانہ نہ ہو؛ حالاں کہ پاخانہ کا برا ہونا ایسا نہیں، جو کوئی نہ جانتا ہو۔ آدمی خوب صورت وہی ہے، جس میں آنکھ، ناک، رخسار کے ساتھ ابرو و مژگاں و زلف و خط و خال بھی ہو؛ حالاں کہ خط و خال اور ابرو اور زلف و مژگاں کی بدشکلی ان کے رنگ سے ظاہر ہے۔ اگر پاخانہ نہ ہو، تو مکان ناقص ہے اور خط و زلف، و خال و ابرو و مژگاں نہ ہو، تو آدمی کا جمال نہ تمام ہے۔

جب ایسی ایسی ذرا ذرا سی چیزوں میں اس اجتماع کی ضرورت ہوئی، تو ایسے بڑے کارخانہ کے حسن کے لیے، جس کو عالم و جہان کہتے ہیں، کیوں کر اس اجتماع کی ضرورت نہ ہوگی۔ اور نہیں تو یہ برائیاں عالم میں کہاں سے آئیں اور یہ تکلیفیں کیوں کر ظاہر ہوئیں۔

القصہ عالم میں برا بھلا، آرام تکلیف سب ہونے چاہییں اور بدلالت آثار پہلے یہ بات ثابت ہو چکی کہ واقعی موجود ہیں، تو اس قسم کے اعتراض جیسے پنڈت صاحب نے پادری صاحب پر کیے تھے، بے شک اہل عقل و انصاف کے نزدیک صحیح نہ ہوں گے۔

حضرت نانوتویؒ اور شہرۂ آفاق:

اب اور سنیے! شاہ جہاں پور کے بازاروں میں مولوی صاحب اور ان کے رفقاء کو نکلنے کا اتفاق ہوا، تو ہندو دکانداروں کی بھی انگلیاں اٹھتی تھیں، اس کے بعد ضلع سہارنپوں میں بعض صاحب وہاں سے پھر کر آئے، تو مولوی ذو الفقار علی صاحب، ڈپٹی انسپکٹر مدارس سرکاری ضلع سہارنپور ساکن دیوبند نے ان سے فرمایا کہ: ایک صاحب لیکھ راج نام ساکن سہارنپور ہیں، ان کو بھی اس قسم کی تحقیقات کا شوق ہے، منشی پیارے لال صاحب کی ان سے خط و کتابت بھی تھی اور اس دفعہ وہ خود بھی اس میلہ میں تشریف لے گئے تھے، بعد مراجعت میری ان کی ملاقات ہوئی، تو انہوں نے

بھی ایسا ہی بیان کیا، جیسا اہل اسلام نے آ کر بیان کیا تھا؛ بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی بیان کیا کہ ایک مولوی صاحب قاسم علی نام اسی طرف کے تھے، ان کا حال کیا بیان کیجیے، ان کے دلیر تو سرستی بول رہی تھی۔ مولوی صاحب کے فرمانے سے معلوم ہوا کہ ''سرستی'' زبان سنسکرت میں ''علم کی دیبی'' کو کہتے ہیں۔

علی ہذا القیاس بعض صاحب جو بعد اس واقعہ کے ملے، تو ان سے معلوم ہوا کہ وہ بھی ساکن شاہ جہاں پور ہیں اور وہ میلہ میں بھی تشریف لے گئے تھے، ان کو، یا ان کے بعض آشناؤں کو میلہ کی برخاستگی سے اگلے روز آنے کا اتفاق ہوا، راہ میں ہندو گنوار جو ملے، ان کو یہ کہتے ہوے سنا کہ: پٹھان جیتے، چوں کہ شاہ جہاں پور میں اہل اسلام اکثر پٹھان ہی ہیں؛ چناں چہ اسی وجہ سے وہ شہر پٹھانوں کا مشہور ہے، تو ہندو گنوار سب ہی اہل اسلام کو جو میلہ میں آئے، پٹھان سمجھتے تھے۔ فقط۔

حرف آخیر:

اب التماس راقم حروف یہ ہے کہ کمترین نے تا مقدور اصل حال میں کمی بیشی نہیں کی؛ اسی لیے جو بات ایسی تھی کہ کسی تقریر سے مستنبط ہوتی تھی، یا اس کے مناسب تھی، پر اس کے ذکر کی نوبت نہ آئی تھی، اس کو حاشیہ پر لکھ دیا ہے۔

البتہ اس وقت کے الفاظ یاد نہیں رہے، اور نہ بہت سے مضامین کی ترتیب پر اطمینان ہوسکتا ہے، عجب نہیں کہ تقدیم و تاخیر ہوگئی ہو، اطلاعاً عرض کر دیا، تا کہ کسی صاحب کو اور کچھ احتمال نہ ہو؛ مگر ہاں یہ جو کچھ عرض کیا ہے، اس میں عمداً کوئی بات زیادہ یا کم نہیں کی۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى خَيْرِ خَلْقِهِ مُحَمَّدٍ وَّآلِهِ وَصَحْبِهِ وَأَهْلِ بَيْتِهِ وَأَزْوَاجِهِ أَجْمَعِيْنَ.

☆☆☆☆☆☆

اشاریہ

شخصیات:

اماکن:

کتب ورسائل:

(گ):

گفتگوئے مذہبی:-۲۰-

(و):

وید:-۲۶-

ادارے:

(م):

مطبع ضیائی:-۲۰-

حجۃ الاسلام اکیڈمی

دارالعلوم وقف دیوبند

اسلام نے اپنی تاریخ میں ہر آن اور ہر لمحہ یہ ثبوت پیش کیا ہے کہ اس کا چمن ہر موسم میں نئے نئے پھول کھلا سکتا ہے۔ عقل وادراک کے کارواں نے جب سے نقل ووحی کی روشنی میں سفر شروع کیا ہے، اس کے سامنے علم وحکمت، فکر وبصیرت اور فضل وکمال کی ایک وسیع الآفاق کائنات بے نقاب ہوتی چلی گئی، عقل ونقل کے اس حیرت زا ارتباط اور درایت وروایت کے اس محیّر العقول ارتفاق نے ابتداء اسلام میں رجالِ دین کا ایک کہکشانی افق دریافت کیا، جس کو کرۂ ارضی پر ''اصحاب رسولؐ '' کے نام سے جانا گیا، اور اس پاکیزہ گروہ انسانی کے پایۂ استناد، کو الم نشرح کرنے کے لئے رب کائنات نے ''رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ'' کی شہادتِ افتخار اور سند اعتزاز سے سرفراز فرمایا۔

اسلام کے اس عہد زرّیں کے بعد پھر ہر دور میں سیدنا الامام الاعظم ابوحنیفہؒ، سیدنا الامام مالک بن انسؒ، سیدنا الامام الشافعیؒ اور امام غزالیؒ وغیرہ جیسی شخصیات وجود میں آئیں، تیرہویں صدی کے موسم اور دینی احوال کے مناسب حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم النانوتوی علیہ الرحمہ کو وجود بخشا، حجۃ الاسلام علیہ الرحمہ اس بزم میں گو آخر میں آئے مگر پیچھے نہیں بیٹھے۔ انہوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں اور حیرت انگیز علم وحکمت کی بلندیوں سے ہر دور کے اساطین علم اور رجال معرفت کی تصویر پیش کی۔

دارالعلوم دیوبند کی تاسیس کے انقلابی کارنامے اور برصغیر میں دین کی وقیع اور رفیع خدمات کے حوالہ سے وہ کون شخص ہے جو ان کے بارِ احسان سے زیر بار، اور ان کے دینی وتعلیمی کارناموں کا منت کش نہیں ہے۔ ضرورت تھی کہ حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم النانوتویؒ کے علوم ومعارف اور افکار کو سہل زبان میں پیش کیا جائے، ان کی شخصیت اور انقلابی کارناموں سے دنیا کو متعارف کرایا جائے۔ یہ ایک ایسا اہم اور گراں قدر کام تھا کہ جس کی انجام دہی حلقۂ دارالعلوم دیوبند، قاسمی برادری اور فکر دیوبند کے ہر علمبردار کے کاندھوں پر فرض اور قرض کے درجہ سے کم نہ تھی۔

دارالعلوم وقف دیوبند اپنی بے سروسامانی کے باوجود جو کچھ بھی کر رہا ہے وہ خالص نصرتِ الٰہی ہی ہے۔ خدا تعالیٰ کے فضل عمیم اور احسانِ عظیم کا نتیجہ ہے۔

''حجۃ الاسلام اکیڈمی'' کا قیام بھی اسی سلسلہ کی ایک مفید کڑی ہے۔

Ḥujjat al-Islām Academy

Al-jamia al-Islamia Darululoom Waqf, Deoband

Eidgah Road, P.O. Deoband-247554, Distt: Saharanpur U.P. India
Tel : + 91-1336-222352, Mob: + 91-9897076726
Website: www.dud.edu.in
Email: hujjatulislamacademy@dud.edu.in,
hujjatulislamacademy2013@gmail.com